بال وپر

خواجہ احمد عباس کے نام

ہے

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں

فہرست

پیش لفظ

ایک رُوسی ادیب کا مقولہ ہے کہ مذاق اُڑانا مذاق نہیں! ایک انگریز مصنّف کہتا ہے مزاحیہ نگاری سے آسان تر شاید ہی کوئی صنف ہوگی۔ خدا جانے ان دونوں میں سے کون سچا ہے۔ اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر طبیعت موزوں ہو اور "احتیاطی نظر بندی" کا ڈر نہ ہو۔ تو مذاق اڑانا اتنا ہی آسان یا دشوار ہے جتنا شعر کہنا۔ تقریر کرنا یا قوالی پر سر دُھننا۔

مذاق اڑانے کے متعلق سب سے بڑا مذاق یہ ہے کہ جب کبھی مزاحیہ نگار کا نشانہ چُوک جاتا ہے وہ بیچارہ خود مذاق کا نشانہ بن جاتا ہے۔ شاید اسی لئے یسُوع مسیح نے انجیل مقدس میں فرمایا تھا "کسی پر تنقید مت کرو۔ تاکہ کوئی تم پر تنقید نہ کرے"! مزاح اور خاص کر طنز بہت حد تک ایک قسم کی شگفتہ تنقید ہے۔ میری دانست میں اچھی طنز لکھنے کے لئے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

اچھا ہاضمہ ۔ تیز و طرار طبیعت ۔ دماغی توازن ۔ اگر ان تینوں میں سے ایک چیز کی بھی کمی واقع ہو جائے ۔ تو طنز طنز نہیں رہتی ۔ دشنام یا ہجو بن جاتی ہے۔ راشن اور پراپیگنڈا کے دور میں ہاضمے اور دماغی توازن کے ٹھیک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ رہی تیز و طرار طبیعت تو اس کے متعلق عرض ہے

اِک دُھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے!

واضح رہے کہ اس مصرعہ میں آفتاب بمعنی "لاہور" استعمال ہُوا ہے۔ لاہور سے ہجرت کرنے کے بعد جب موگا میں سے مسجد ہو مدرسہ ہو یا خانقاہ ہو کے مصداق سکونت اختیار کی ۔ تو شوخیِ تحریر کی فاتحہ پڑھنے کے لئے اُستاد ذوق کا یہ شعر آڑے آیا ؎

تو ہی جب پہلو سے اپنے دلرُبا جاتا رہا
دِل کا پھر کہنا تھا کیا ۔ جاتا رہا جاتا رہا

دوبارہ واضح رہے کہ اس شعر میں "دلربا" سے مراد "بُتِ کم سِن" نہیں بلکہ لاہور ہے۔

یہ چند سطور محض اس لئے لکھی جا رہی ہیں کہ اگر ان مضامین کو پڑھ کر آپ کو ہنسی کی بجائے رونا آ جائے ۔ تو آپ کھل کر رونے کے بعد مجھ پر نہیں بلکہ میرے ماحول پر ہنسیں ۔

کنھیالال کپور

ڈی ۔ ایم ۔ کالج —— موگا
۲۷ ؍ جون ۱۹۵۳ء

تعارف

کنہیالال کپور کو میں سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں لیکن اُف! اس کے چہرے کے وہ طلسمی نقوش جو ذہن کی پوری گرفت میں کبھی آتے ہی نہیں۔ طلسمی سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس چہرے میں کوئی جادو ہے۔ کوئی افسوں ہے بلکہ یہ کہ کپور کے نقش دیکھنے والے کے لئے ایک بڑی مصیبت بن جاتے ہیں۔ یہ نقوش کچھ قابل اعتراض حد تک مدھم بھی نہیں۔ قابلِ فخر حد تک تیز بھی نہیں۔ یوں سمجھئے کہ تیکھے پن اور دھیمے پن کو اگر ملا جلا دیا جائے۔ اور پھر کوشش کی جائے کہ کپور کے رخسار، کپور کی آنکھیں، کپور کی ناک، اس کے ہونٹ، اس کی ٹھوڑی ذرا واضح اور روشن شکل میں سامنے آجائیں تو اکثر ناکامی ہوگی۔ ناک کے پورے نقشے کو پکڑتے پکڑتے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ناک نہیں ہے رخسار ہے۔ اور پھر رخسار کی طرف نگاہ دوڑائی جائے تو وہاں آنکھ کا سا عالم طاری دکھائی دیتا ہے ——— اسی لئے

تو میں اپنی مجبوری اور بے چارگی کا اظہار کر رہا ہوں۔ کہ اس شخص کے صحیح ترین نقش کا مکمل تصور کرنا اور اُن سے کوئی صاف تصویر بنا سکنا انتہائی مشکل ہے۔

ویسے اگر عام فہم انداز میں کہا جائے تو ایک منٹ میلے سے چہرے پر لمبی سی ناک دکھائی دیتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں جن کو عینک کے بڑے بڑے شیشوں نے بُری طرح چھپا رکھا ہے۔

یہ شیشے اکثر دبنیز لیڈی کٹ کے ہوتے ہیں۔ جس سے شاید کپور اپنے چہرے کو نسائیت کا دھوکا دینا چاہتا ہے۔

ہڈیوں بھرے، پچکے ہوئے گال۔ لکیروں بھری پیشانی، چہرے کی نسبت سے کان بڑے بڑے ——— گویا تمام چیزیں ایسی جن میں کھٹک کر کھڑا کر دینے والی یا لمحہ بھر کے لئے ہی مبہوت بنا دینے والی کوئی کیفیت دکھائی ہی نہیں دیتی۔ استدادِ زمانہ کی ٹھوکروں کے نشانات کا احساس چہرے کے ہر مسام سے پھوٹا پڑتا ہے اور ان بدلتے ہوئے مساموں کو دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ ہاں! ایسا شخص ہی طنز نگار بن سکتا ہے۔ بیحد دکھی اور الم رسیدہ مسامات۔ زیرِ لب تبسم یا گل بدامن مسکراہٹیں تو بکھرنے سے رہے۔ ان سے تو قہقہہ ہی پھوٹ سکتا ہے۔ زہریلا قہقہہ، جس کی تلخی میں ایک بھرپور وار ہو۔ جس کی لہریں گرد و پیش سے ٹکرائیں اور ہر آدمی کو کپکپا دیں۔

بادی النظر میں کپور کو دُور سے دیکھئے۔ یا دُور ہی سے کیوں؟ چاہیے

آپ نزدیک آکر گھور گھور کر اسے دیکھئے۔ تو ایک عام سا شخص رسیدہ آدمی دکھائی دے گا۔ جس سے کسی خاص منفرد قسم کی ذہانت یا فراست کا پتہ نہیں چلتا اور حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ادیب اور آرٹسٹ تو کجا۔ کسی عام سی بات کو بھی ذرا علیحدہ اور اثر انگیز ڈھب سے بیان نہیں کر سکتا ہوگا ——— ہمارا طبقاتی نظام اپنے استبداد کی بدولت بہت کم لوگوں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اگر انہیں چوٹ لگے تو وہ "اوئی" بھی کر سکیں۔

دباؤ اور گھٹن ہی اس نظام کے استبداد کا عام سا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ دباؤ اور گھٹن کپور کے نصیب میں بھی شامل ہو جاتا۔ لیکن اس کڑے کلیجے والے آدمی نے چوٹ کے ساتھ ہی ساتھ "اوئی" کا اظہار بھی سیکھ لیا۔ اس "اوئی" کو جاری رکھنے کی عادت بھی پیدا کر لی۔ اور یوں دباؤ اور احتجاج کی مسلسل نبرد آزمائی نے اسے قہقہہ لگانے کا فن سکھا دیا۔ اس قہقہے میں بے ساختگی تو ہے۔ لیکن کڑوی کسیلی بے ساختگی۔ اس میں زندگی تو ہے لیکن چیختی چلاتی زندگی ——— مسرت اور ہنسی کے پردے پر کپور کے کھینچے ہوئے نقش و نگار کی شکل دیکھ کر ایک دنیا لرز اٹھتی ہے۔ خوف سے کانپ کانپ جاتی ہے۔ اور یہی کپور کا آرٹ ہے۔ جو اس کی منفرد شخصیت کا مظہر بھی ہے۔ اور جس نے دوسری شخصیتوں کا احاطہ بھی کر رکھا ہے۔ غالب کے الفاظ میں سادگی و پرکاری ہی اس کے کیریکٹر کا اہم عنصر ہے۔ اور سادگی و پرکاری ہی اس کے

آرٹ کا راستہ۔

چہرے کو علیحدہ کر کے دیکھئے۔ تو کپور کا باقی سارا جسم اتنا نمایاں اور ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کہ میل بھر سے پہچانا جا سکتا ہے۔ پنجابی زبان کی ایک مخصوص اصطلاح "لم سلما" سے ذہن میں جو جاذب نظر اور رومانٹک سی تصویری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ کپور اس سے مکمل طور پر محروم ہے۔ لیکن "لم سلما" کا لفظ اس پر صادق خوب آتا ہے۔ لمبے لمبے بازو، لمبے لمبے ہاتھ، لمبی لمبی ٹانگیں جو سڈول نہیں ہیں۔ جن میں اگرچہ مستقیمی ضرور ہے۔ مگر حسین بناوٹ نہیں۔ لمبی لمبی پیٹھ پر ہلکا سا جھکاؤ اور کمر کے گرد مجبورانہ قسم کی حسینانہ لچک۔ چلتا ہے تو جیسے پورا جسم بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ناچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ لچک اور بل ایک خاص آہنگ پیدا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان سے اگر کسی کو یہ خطرہ پیدا ہونے لگے کہ لچکتے لچکتے یہ جسم کہیں راستے ہی میں اچانک ٹوٹ کر آ رہے گا۔ تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ ان لمبی لمبی ہڈیوں میں زندہ رہنے کی بے پناہ قوت ہے۔ ان کی لچک میں موت کی دعوت نہیں۔ بلکہ زندگی کا ایک مسلمہ اور بے باک ڈھب پایا جاتا ہے۔ یہ پتلا پتلا جسم، سنگینوں اور سختیوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کا عامیانہ خطرہ بے معنی ہے۔

اسے اپنے اس پتیلے جسم کا خود بھی کافی احساس ہے، ایک مرتبہ

جب وہ ایک انگریز خاتون سے ملا۔ تو اس کا یہ احساس ایک نہایت طنزیہ لطیفے کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس خاتون نے کپور کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے کہا۔ کپور صاحب!

"YOU ARE AS THIN AS A NEEDLE"

کہ آپ تو اتنے پتلے ہیں جتنی سوئی ہوتی ہے۔ کپور نے بے ساختہ بھولپن سے جواب دیا۔ محترمہ! آپ ذرا مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔ چند ایک سوئیاں مجھ سے موٹی بھی ہوتی ہیں۔

اسی لئے عورت کے متعلق کپور کا خیال ہے کہ وہ کم بخت جسم پہ مرتی ہے دماغ پر نہیں۔ اور دماغ پر شاید اس لئے نہیں مرتی۔ کہ بے چاری کے پاس دماغ ہوتا ہی نہیں۔ (شاید کپور مردانہ برتری سے دامن نہیں چھڑا سکا)۔

جب وہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہو۔ تو اس کے مسخرے کیریکیر میں سونے پر سہاگہ کا کام ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لہراتے اور جھومتے ہوئے کوٹ پتلون کپور سے لگا تو کھا نہیں سکتے۔ اس لئے اس کے پتلے پتلے جسم کی غمازی کرنے کے فعل میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا درزی بھی شاید اس منحنی اور لچکیلے جسم پر کسی قسم کا سوٹ فٹ نہ کر سکے۔ ویسے میں نے کئی بار چاہا ہے کہ یوں کوٹ پتلون پہنے ہوئے کپور سے جا کر کہہ دوں ـــــــ "طنز نگار! اگر تمہارے ہاتھ میں چھڑی دے دی جائے۔ اور سر پہ میناری فلیٹ اور اس کے ساتھ ہی خشخشی داڑھی

کا اضافہ بھی کر دیا جائے ـــــــ تو تم برنارڈ شا معلوم ہونے لگو ۔ ممکن ہے میرے اس مذاق کو کپور سنجیدگی کا روپ دے دے ۔ اور کبھی دن تنہائی میں اپنے لباس کو برنارڈ شا کے معیار کا لباس بنا کر دیکھ لے ـــــــ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے شا کی نقل کو بھونڈی نقل سمجھے گا ۔ اور کبھی اسے عملی جامہ نہیں پہنائے گا ۔

کپور کی عام زندگی جن جن سیڑھیوں سے گذری ۔ اس میں بہت کم اہم واقعات یا حادثات پائے جاتے ہیں ۔ ایک اوسطاً ذہین لڑکے کی طرح میٹریکولیٹ ، ایف اے ، بی ۔ اے ، اور ایم ۔ اے کے مراحل طے کرتا رہا ۔ امتحانوں میں کبھی دوسرا اور کبھی چوتھا رہا ۔ بقول کپور کے زندگی میں کبھی اوّل رہنے کے فخر کو برداشت نہیں کر سکا ۔ ہاں جب پیدا ہوا ۔ تو پہلی جنگ عظیم چھڑنے میں ابھی چار سال باقی تھے ۔ اس لئے اس حادثے سے بھی محروم رہا ۔ ایک بار موڈ میں آ کر وزن تولنے والی مشین میں اکنی ڈال بیٹھا ۔ بس پھر تو زبردستی تُلنا پڑا ۔ اور ثابت ہوا ۔ کہ حضرت پچاس سیر سے کچھ زیادہ ہیں ۔ اس وقت سے آج تک اس قسم کا موڈ دوبارہ پیدا نہیں ہوا ۔ اور کپور صابر و شاکر ہو کر بیٹھ رہا ۔ کوئی درزی جب اس کی قمیض کا ماپ لیتے وقت چھاتی ماپنے لگتا ہے . تو اسے نہایت بے تکلف انداز میں کہہ دیتا ہے ۔ "بھئی جانے دو ۔ نہیں انچ سے زیادہ کبھی بڑھ ہی نہیں سکی کمبخت !"

گھر میں وہ باریک اور مہین ململ کی دھوتی پہن کر پھرتا ہے لیکن

پھرنا کہاں ہے وہ؟ پھرنے کی اس میں تاب ہی کہاں باقی رہ گئی ہے۔ وہ تو بس دھوتی پہن کر ریڈنگ روم میں پڑے ہوئے صوفے پر لیٹا رہتا۔ اور پڑھتا رہتا ہے نہیں پڑھتا ہے بھئی میں نے غلط کہا۔ اسے پڑھنے کے لئے دم ہی کون لینے دیتا ہے؟ وہ تو بمشکل صبح کا ڈیلی اخبار سرسری نگاہوں سے دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جونہی صبح وہ بغیر ہاتھ منہ دھوئے، داتن کئے، دھوتی پہنے اس صوفے پر آ کر بیٹھتا ہے۔ تو ملنے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا ہے۔ ان ملنے والوں میں کالج کے ذہین طالب علم ہوتے ہیں جو اپنے ذہن پر جلا کرنے کے لئے آتے ہیں اور کپور کے سامنے یوں بے تکلف بیٹھے رہتے ہیں۔ جیسے وہ ایک پروفیسر نہ ہو۔ جس سے خوف کھایا جا سکے۔ بلکہ ایک ذہین ترین دوست ہو جس سے گھل مل کر باتیں کی جا سکیں۔ اور اخذِ لذت کے ساتھ ہیں اخذِ علم کیا جا سکے۔ ——— پھر کئی ایک مفلس طالب علم ہوتے ہیں۔ جو اس سے زندگی کے رکے ہوئے دھارے کو آگے چلانے کے مشورے حاصل کرنے آتے ہیں۔ کالج کی کتابوں کے پبلشر ہوتے ہیں جن کے بینک بیلنس کا بتدریج اضافہ، کپور کے تیز و طرار قلم کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ یہ پبلشر اس کے آگے پروفوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے اس کے قلم کو دیکھ کر چاہتے ہیں۔ کہ یہ قلم چلے اور اس تیزی کے ساتھ چلے کہ کل صبح ہی انہیں ڈیڑھ سو صفحے کے پروف تصحیح شدہ حالت میں ہی مل جائیں۔

پھر چھوٹے بڑے ادیب ہوتے ہیں۔ چھوٹے ادیب کپور کی دلچسپ باتیں سننے کے لئے آتے ہیں۔ بڑے ادیب چالو ادبی سیاست گری پر اس سے بحث کرنے کے لئے آتے ہیں۔ رسائل کے ایڈیٹر آتے ہیں جو اپنے پرانے سالناموں کی ہیبت کا رعب جما کر اس سے مضمون کا وعدہ مانگنے آتے ہیں۔ ادبی کتابوں کے ناشر آتے ہیں۔ جو کپور کی تعریفوں کے پُل باندھ کر بغیر رائلٹی کے اس سے کتاب کا مسودہ لے جاتے ہیں۔ محلّے کے کلرک آتے ہیں۔ جو اس کے ساتھ کانگریس، مسلم لیگ اور راشٹریہ سنگھ کی سرگرمیوں پر بحث کرنے لگ جاتے ہیں۔ فلم پرڈیوسر آتے ہیں جو اسے کلکتے اور بمبئی کے طلسم زار میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اور چند ایک رشتہ دار آتے ہیں جو کپور کو اس درجہ مصروف دیکھ کر کفِ افسوس ملتے ہیں کہ وہ اپنے گھر بار کا مطلق خیال نہیں کرتا۔ اور بے معنی اور بے فائدہ باتوں میں گھِر کر بگڑ گیا ہے۔

کپور ان سب آنے والوں کا ایک معنی خیز تبسّم سے استقبال کرتا ہے۔ صوفے پر سے قدرے اُچھلنے کی سی کیفیت میں اُٹھتا ہے۔ پھر انہیں سگرٹ پیش کرتا ہے، چائے پلاتا ہے، ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے، نہایت شگفتہ اور محبوب لہجے میں ان سب کے مسائل کو چٹکیوں میں حل بھی کر دیتا ہے۔ اور وہ سب ہی یہ خیال لے کر چلے جاتے ہیں کہ کپور ایک نہایت مخلص آدمی ہے۔ نہایت گریٹ آدمی ہے۔ نہایت معقول آدمی ہے۔ اس کی باتیں خاص پیچیدہ نہیں ہوتیں۔ نہ ان میں عالمانہ رنگ

ہوتا ہے۔ اور نہ ان سے کسی ذہنی گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ بے ساختہ تسلسل کے ساتھ باتیں کر رہا ہوتا ہے۔ جب ہر دوسرے تیسرے فقرے پر وہ ایک پنچے تلے قہقہے کے ساتھ ملاقاتی کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے۔ داد کی تالی بجاتا ہے۔ اس کے کندھوں پر، پیٹھ پر، زانو پر ہاتھ مارتا ہے۔ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑی بات کہی گئی ہے۔ لیکن اس کہی جانے والی بڑی بات کی پوری شدت اس لمحے بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات تو حیرت بھی ہوتی ہے۔ کہ کپور نے کوئی خاص اہم اور عظیم بات تو کہی نہیں۔ پھر یہ کا میٹھا یہ قہقہہ کیوں؟ یہ ہاتھ پر ہاتھ مارنا کیسا؟ مگر آپ کپور سے جدا ہو جائیے۔ تو دو تین گھنٹے کے بعد آپ اپنے اندر اس قہقہے کا اثر محسوس کریں گے۔ اور اس شدت کے ساتھ چونک پڑیں گے۔ جیسے واقعی کسی بہت بڑی بات پر چونکا جا سکتا ہے۔ بس یہی کپور کی باتوں کا طلسمی پہلو ہے۔ اتنے لاابالیانہ پن سے، اتنی بے نیازی سے باتیں کرے گا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیا کے بڑے سے بڑے حادثے کو اپنے اندازِ بیان کی بے پروائی سے یوں بے معنی اور بے اثر بنا کر رکھ دے گا۔ اور آپ کے ذہن پر پڑے ہوئے بوجھ کو یوں ٹل جانے کا اشارہ دے گا۔ کہ ایک بار تو دماغ پر ایک لطیف قسم کا غبار چھا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، کپور سے جدا ہونے کے بعد آپ سوچیے۔ کہ کپور کا قہقہہ بے پناہ معنی پیدا

کرتا ہوا آپ کے دِل و دماغ میں گونج رہا ہوگا۔ جیسے کہہ رہا ہو ——
"میری جان! تم اس حادثے کو مذاق سمجھ رہے تھے؟ یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کی ضرب نہایت کاری ہے۔ ذرا احتیاط کرنا اور نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ زندگی اتنی سادہ، لطیف اور نظرانداز کئے جانے کے قابل چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک بھرپور چوٹ ہے۔ اس چوٹ کو سہنے کی قوت پیدا کرو۔ ورنہ مر جاؤ گے۔ پس جاؤ گے!"

کپور کی باتوں کا بے ساختہ انداز اور ہلکا پھلکا پن اتنی خوفناک سنجیدگی کے اثرات رگ و پے میں چھوڑ جاتا ہے کہ بسا اوقات تو میں اس سے دوبارہ ملتے ہوئے ڈرنے لگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ وہ پھر اسی بے ساختہ پن سے باتیں کرے گا۔ قہقہے لگائے گا۔ ہاتھ پہ ہاتھ ماریگا۔ اور اپنے انداز کی شدّت چھپی ہوئی گہری قنوطیت۔ پتھریلے دُکھ اور اٹل غمگینی کی پرچھائیں بھی مجھے نہیں دکھائے گا۔ کتنا خوفناک ہے۔ یہ طنز نگار کتنا بڑا مذاق کرتا ہے یہ دُنیا بھر سے، کتنی پیچیدگی کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے اصلی مرکز تک پہنچنے کے لئے۔

وہ آپ کو پتہ نہیں چلنے دے گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ کیوں کہہ رہا ہے؟ —— جو کچھ اُسے کہنا چاہئے۔ کیا اُسی چیز کے متعلق ہی کہہ رہا ہے؟ آپ کے مسئلے کو وہ کسی بندھے بندھائے فارمولے کے ذریعے حل نہیں کرتا۔ کسی بنے بنائے زاویے سے اُسے نہیں دیکھتا اگر آپ اس سے پوچھیں —— کہ پانچ میں سے آٹھ تفریق کر دیئے

جائیں۔ تو کیا باقی رہے گا۔ تو وہ ایک مخصوص قہقہہ کے ساتھ آپ کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہے گا ——— چھوڑو یار! اگر کچھ بچ بھی گیا۔ تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ ویسے میرے خیال میں آٹھ کا ہندسہ کوئی معقول ہندسہ نہیں ہے۔ اگر اس کا نام آٹھ نہ ہوتا۔ بلکہ کچھ اور ہوتا۔ مثلاً دو یا تین۔ تو زیادہ خوبصورت شکل اختیار کر سکتا تھا"۔

اور پھر وہی بے ساختہ قہقہہ۔ جیسے کسی بہت بڑے تالاب میں زہر کی چٹکی نہایت تیزی کے ساتھ گھول رہا ہو۔ وہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ کہ کسی بات کا واضح شعور دکھ کی علامت ہے۔ اور وہ دنیا کو دکھ دینے نہیں بلکہ دکھوں پر مسکراہٹ کا رنگ چھڑکنے کے لئے آیا ہے۔ اگر کوئی دکھ مسکراہٹ کے خوش رنگ پردے میں لپٹا لپٹایا ہوا زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا رہے۔ تو اس کم بخت کی ٹیسیں تو کم ہو جاتی ہیں ——— اس لئے کپور کی باتیں سمجھ میں کم آتی ہیں۔ جذبات سے زیادہ نزدیک ہوتی ہیں۔ کپور جو کچھ کہتا ہے۔ اس سے اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ بات کر رہا ہے یا مذاق میں اڑا رہا ہے۔ اس لحاظ سے تجاہل عارفانہ کی ترکیب اس کی شخصیت کے لئے نہایت موزوں بن جاتی ہے۔

اور اس کے کردار کی یہی خوبی (اگر اسے خوبی کہا جا سکے) اس کے طنزیہ آرٹ میں بری طرح گھس کر آگئی ہے۔ وہی سادہ سادہ سے فقرے وہی ہلکے پھلکے سے الفاظ، عام فہم سا شگفتہ بیان۔ لیکن آپ کی

نظر اس کے مضمون پر پھیلتی چلی جائے گی۔ آپ کے دماغ میں ہنستی کھیلتی ہوئی ٹیسیں اٹھتی چلی جائیں گی۔ اور ایک سادہ سے تسلسل میں گندھا ہوا اس کا مضمون آپ کے دل و دماغ کو بے چین کرتا چلا جائے گا۔ یہ بے چینی مٹھاس بھری ضرور ہو گی۔ لیکن اس مٹھاس سے آپ کو چڑچڑاہٹ بھی ہونے لگے گی۔ کہ اس شخص کو پڑھنے والے پر اتنا بھی رحم نہیں آتا۔ کہ اگر ضرب لگانی ہے تو ایک ہی مرتبہ سیدھے سبھاؤ لگا دو۔ یہ بھی کیا کہ چوٹ بھی لگائی اور پھر دماغ میں اس قسم کی کیفیت بھی پیدا کر دی۔ کہ "برادرم"! اس چوٹ کو ہلکے ہلکے سہلاؤ۔ بڑا مزا آئے گا۔ سہلانے کا مزا مسلّم! مگر اس سے چوٹ کا مادی نتیجہ تو بدل کر نہیں رہ جائے گا۔

اور میں کہتا ہوں۔ کہ کپور نتیجے کی حقیقت تک تو آپ کو پہنچا ہی دیتا ہے۔ اور اس راستے سے پہنچا دیتا ہے جیسے آپ کسی ریشمی ہنڈولے میں جھولتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے ہوں اور نتیجے تک نہایت خوبصورت اور خوشگوار انداز میں پہنچا کر آپ کو چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس لئے چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی ذمہ داری یہاں تک آ کر ختم ہو جاتی ہے اس کا کام تو یہی ہے کہ نہایت پُراسرار اور خوبصورت چالاکی کے ساتھ آپ کو زہریلی حقیقت کے پاس لے جائے۔ اگر وہ آپ کو کانٹے بھرے راستے سے لے جاتا۔ تو ممکن ہے آپ راستے ہی میں دم توڑ کر رہ جاتے لیکن وہ انسانیت کا ظالم جراح نہیں

ہے ہمدرد ڈاکٹر ہے ——— اس ہمدرد ڈاکٹر کے پاس اپنا ایک
خاص قسم کا کلوروفارم ہے جس کے ذریعے وہ انجکشن کرتا ہے۔ یہی
کلوروفارم اس کا آرٹ ہے۔ اس مخصوص کلوروفارم ہی سے
کپور کے مریض صحت و شفا کا کھیل کھیلتے ہیں۔
چونکہ وہ کوئی دیوتا اور فرشتہ نہیں ہے۔ اس لئے عام
انسانی خصائص اپنی کمزوریوں اور خوبیوں کے ساتھ اس میں بھی
موجود ہیں بعض لوگ اس کی ان کمزوریوں کا ذکر کر کے لذت حاصل
کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے اگر
آپ اس کے سامنے سگریٹ کی بھری ہوئی ڈبیہ پھینک دیں۔ تو وہ
اپنے بہت سے اہم پروگرام بدل کر اس سگریٹ کی ڈبیہ کو ختم کرنے
کی خواہش میں گرفتار ہو جائے گا۔ اور آخری سگریٹ نکال کر اسے
سلگاتے ہوئے ایک انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوگا۔ جیسے وہ انگڑائی
کہہ رہی ہو "اب کیا رہ گیا ہے اس ڈبیہ میں۔ اب بیٹھے رہنے کے
کیا معنی ہیں؟" ——— ہوٹل میں چائے کا بل اگر کوئی دوسرا
ادا کرے تو اس کی طرف یوں دیکھے گا "جیسے کہ کہہ رہا ہو "ٹھیک
کیا تم نے دوست! تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا"، شراب کا کوئی
پیگ اگر کبھی کسی نے پلا دیا۔ تو پی لے گا۔ ورنہ عمر بھر اس کے بغیر جی
سکتا ہے ——— لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مالی اعتبار
سے کنجوس ہے۔ نہیں۔ اس کے گھر پر جائیے آپ کو سگریٹ پر سگریٹ

پیش کرتا چلا جائے گا۔ چائے پر چائے پلائے گا۔ بسکٹوں اور مٹھائیوں سے آپ کی تواضع کریگا۔ اور آپ کو فرطِ حیرت میں چھوڑ جائے گا۔ کہ یہ شخص جو کل چائے کی میز پر اپنی بظاہر کنجوسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ آج اسے کیا ہوگیا ہے؟ یہ کیونکر بغیر سمجھے بوجھے دھن لٹاتا چلا جا رہا ہے۔

مگر ایسا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ وہ ایک عام قسم کا سماجی انسان بھی ہے۔ اس کی کرداری انفرادیت۔ عام سماجی ماحول میں آکر اس سے بالکل علیحدہ ہو جاتی ہے۔ اسے بیوی سے محبت بھی کرنی پڑتی ہے۔ گھریلو ضروریات کی چیزیں بھی مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ ایک پروفیسر کے سے معیار کو قائم رکھنے کے لئے گھر کی فضا کو بھی اسی معیار میں ڈھالنا پڑتا ہے بچے بھی پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال، پڑھائی لکھائی کا دھیان بھی کرنا پڑتا ہے۔ اپنی چھوٹی سی بچی کے ساتھ توتلی زبان میں بھی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اُسے ہنسانا اور گدگدانا بھی پڑتا ہے۔ جب اس کے دونوں بچے تیر کمان سنبھالے لکڑی کی بندوق بنائے اس کے سامنے اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ تو انہیں داد کے سے انداز میں ڈانٹنا پڑتا ہے اگرچہ یہ ڈانٹ اکثر بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ کپور میں روایتی باپ کا سا دبدبہ مفقود ہے۔ اس کی ڈانٹ میں مسکراہٹ کا سایہ شامل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنا اثر کھو بیٹھتی ہے اس کی ڈانٹ۔

اسے مالی لحاظ سے کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنی آمدنی کے مقابلے پر کم خرچ کرنا جانتا ہے۔ پھونک پھونک کر خرچ کرتا ہے۔ بیوی پر، بچوں پر۔ گھی پر۔ راشن پر۔ لکڑیوں پر، اور اسی طرح کی سینکڑوں دوسری ضروریات پر۔ لیکن اس کی پیشانی پر بل نہیں آتے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے۔ کہ ڈیڑھ سو صفحے پروف پڑھانے والا پبلشر اس کا غلام ہے۔ وہ اس کی تمام مشکلیں حل کر سکتا ہے۔ ادبی تخلیقات نے اسے کبھی مالی امداد بہم نہیں پہنچائی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی پہلی کتاب ایک پبلشر کو مفت دے دی تھی۔ اور دوست احباب کے احتجاج کرنے کے باوجود اس کی یہ ہمت نہیں پڑی تھی۔ کہ اس پبلشر سے پیسوں کا تقاضا کر سکے۔ مگر پھر بھی مالی اعتبار سے وہ مطمئن ہے۔ اس لئے کہ اس کی زندگی کے نظام میں ایک توازن اور باقاعدگی اور احتیاط شامل ہو چکی ہے۔ غریب والدین کا بیٹا مالی اعتبار سے لاابالی پن اختیار ہی نہ کر سکا۔ اگرچہ ایسے مواقع کئی آئے تھے جبکہ وہ اپنے دیرینہ خاندانی افلاس سے انتقام لے کر زندگی کو بے اختیار اور پُر مسرت لہروں پر بہنے کے لئے چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اور ایک مخصوص سماجی انضباط کے نیچے سے رہائی نہ پا سکا۔ اسی لئے تو اُسے محلّے والے ایک شریف آدمی کہتے ہیں۔ ایک معزّز پڑوسی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سماجی اعتبار سے وہ بیشتر باتوں میں ہمارا ساتھی ہے۔ اور کوئی علیحدہ ڈرا دینے والی یا حیرتناک

شخصیت نہیں ہے۔

لیکن کیا کپور واقعی ایک شریف آدمی ہے؟ ایک معزز پڑوسی ہے کیا جب وہ گفتگو کر رہا ہوتا ہے تو یوں محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ملاقاتی کو بنا رہا ہے۔ اور اس بنانے میں اُسے انتہائی ابلیسانہ قسم کی لذّت محسوس ہو رہی ہے۔ اس قسم کی ابلیسانہ لذت کا مظاہرہ اس نے ایک بار ایک محفل میں کیا تھا۔ بدقسمتی سے ایک آدمی کپور سے بحث میں اُلجھ پڑا۔ کپور نے دوران گفتگو میں اس سے کہا۔ میں آپ کو شریف آدمی سمجھتا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے اور چوٹ کا جواب چوٹ میں دینے کی غرض سے اس شخص نے بھی کپور سے کہہ دیا کہ میں بھی آپ کو شریف آدمی ہی سمجھا تھا۔" یہ چوٹ کوئی اتنی وزنی نہیں تھی۔ اس لئے کپور نے چوٹ کو وزنی کرنے کی خاطر اس شخص سے کہا "آپ ٹھیک سمجھے تھے دراصل غلطی مجھ سے ہوئی۔"

اور ایک لمحے تک تو وہ آدمی کچھ جھینپا سا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب ساری محفل کو چوٹ کی گہرائی کا احساس ہوا۔ تو سارے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

کپور اس قسم کا بہادر آدمی بھی نہیں ہے کہ اپنے مخالف کو بیباکانہ چیلنج کر سکے۔ اپنے بل بوتے پر اعتماد کر کے اسے محاربے کے لئے پکار سکے اگرچہ ایک طنز نگار کی زندگی ایسے حادثوں کے امکانات سے بھرپور ہو جاتی ہے جن کی وجہ سے مخالفین کی ایک عجیب و غریب جماعت

پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کپور کے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے۔ وہ اگر کوئی چوٹ کرتا ہے۔ کیونکہ وہ چوٹ کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ تو بعض چوٹ سہنے والے بلبلا اٹھتے ہیں۔ اور جب یہ بھی دیکھتے ہیں کہ چوٹ لگانے والا کپور جیسا مسخنی اور ڈبلا پتلا شخص ہے تو آنکھیں بھی نکالنے لگتے ہیں۔ اگر جواب میں کپور بھی آنکھیں نکال سکتا۔ تو شاید کپور آج اپنی شکست خوردہ حالت میں دکھائی نہ دیتا۔ اس کی شخصیت کے تمام خطوط اس امر کی غمازی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ——— کہ مجھ سے تمہیں کیا لینا ہے بھائی؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ میں تمہارا کچھ بگاڑ بھی کیا سکتا ہوں؟ میں تو ایک شریف سا انسان ہوں۔ باقی رہی طنز۔ وہ تو میرے بس کا روگ نہیں۔ اس پر میرا کچھ اختیار بھی نہیں۔ وہ تو میری فطرت میں بغیر اتہ پتہ لگائے داخل ہو گئی۔ کہ اس افلاس زدہ ہڈیوں کے ڈھانچے اور کمزور سے انسان کے اندر داخل ہونا اس کے ساتھ مذاق کرنا تو نہیں۔

چنانچہ سپردگی اور بے چارگی کا یہ انداز اسے کہیں بھی مقابلہ بازی کی حیثیت میں پیش نہیں ہونے دیتا۔ ایک مرتبہ لاہور کی ایک ادبی انجمن حلقۂ ارباب ذوق میں اس کے ایک طنزیہ مضمون پڑھنے پر لاہور کا ایک سیاسی وکیل اور ادبی مجاہد کھلا اٹھا تھا۔ اور کپور کے خلاف وہ طوفانِ بدتمیزی اٹھایا تھا کہ کپور کو اعترافِ شکست بھی کرنا پڑا تھا۔ اور معافی بھی مانگنی پڑ گئی تھی

اسی طرح ایک دوسری مرتبہ اس کے مشہور مضمون "اہلِ زبان" پر لاہور سے پٹنہ تک ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ اور چاروں طرف سے "تراہ مان ! تراہ مان !!" کی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔ وہ تو کہیئے۔ چند ایک پشت پناہوں نے کپور کو اہل زبان کے ان تابڑ توڑ حملوں سے بچا لیا۔ ورنہ شاید کپور یہاں بھی معذرت طلب کر کے یہ وعدہ کر لیتا کہ میں ہندوستان چھوڑ کر چین چلا جاؤنگا۔ اور اسی طرح اپنی طنزیہ عظمت کا ایک اور ثبوت مہیّا کر دیتا۔ کہ دوستو! مجھ میں لڑنے مرنے کی تاب نہیں ہے۔ ویسے انصاف سے دیکھا جائے۔ تو تم میں بھی کوئی خاص ایسی تاب داب نہیں ہے۔ جس کے بوتے پر تم میری طنز کو برداشت کر سکو۔ طنز برداشت کرنے کے لئے میرے جیسا کلیجہ چاہیئے۔ ویسے تمہاری تلملاہٹ سے مجھے اتنی تسکین تو ہی جاتی ہے کہ میری باتوں میں واقعی چبھن ہے۔ اور چبھن جھوٹ پر نہیں ہمیشہ سچ کی نوک پر نمودار ہوتی ہے۔

بہت سے قسم کے لوگوں میں کپور کو عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ عزّت بھی ہر جنس کے لئے مختلف قسم کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ پروفیسر لوگ کپور کی عزّت اس لئے نہیں کرتے۔ کہ اس کا ایک ادبی مقام ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ پڑھانے کے ایک خاص ڈھب کا مالک ہے۔ کالج کے طالب علم اس کی عزّت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک پاپولر پروفیسر ہے بلکہ اس لئے کہ اس کے لکھے ہوئے "خلاصے" بڑے کام کی چیز

ہوتے ہیں اور امتحانوں کے پاس کرنے میں مدد پہنچاتے ہیں ۔ ادیب لوگ اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک اچھا ادیب ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی ہے ۔ پبلشرز اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے ۔ کہ وہ اچھی گفتگو کر سکتا ہے ۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی کتاب بکتی خوب ہے ۔ محلے والے اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ایک اچھا پروفیسر ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک شریف پڑوسی ہے اس کے اپنے بچے اس کی عزت اس لئے نہیں کرتے ۔ کہ وہ ایک جابر باپ ہے ۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی عزت کرنے میں کوئی خاص بنیادی فرق نہیں پڑ جاتا ۔ اور اب رہی اس کی بیوی، تو وہ کپور کی عزت ایک ایسے خاوند کے نقطۂ نظر سے کرتی ہے ۔ جس کا اس دنیا میں سوائے بیوی کے کوئی نہ ہو ۔

ایک اور قسم کی عزت سب سے نرالی ہے اور کپور کے شایانِ شان بھی ۔ اور وہ ہے لاہور کی ایک دیرینہ ادبی انجمن کی طرف سے کپور کی عزت افزائی ۔ اور وہ یوں کہ اس حلقہ کے بعض سر برآوردہ ارکان اس کی عزت اس لئے کرتے ہیں کہ عزت کئے بغیر ان کے سامنے اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا ۔ ورنہ بقول کپور کے، اگر ان کا بس چلے ۔ تو کپور کو کچا چبا جائیں ۔ اور اس کے مضمون میں زبان کی غلطیاں نکال نکال کر کپور کو ادھ موا کر دیں ۔

حسن اور عشق کے روایتی معاملہ میں کپور کے کاغذات بالکل کورے

چلے گئے ہیں - ان کاغذوں کو چھوا تک نہیں گیا - اور آج تک یہ
عالم ہے - کہ اس کورے کاغذ کو چھیڑنے کی کسی میں ہمت بھی پیدا نہیں
ہوتی - اگر وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر سامنے کی چھت پر
کھڑی ہوئی عورت کی طرف نگاہِ التفات سے دیکھ بھی لے تو وہ عورت
اتنا بھی نہیں کرے گی کہ دوپٹہ کا پلّو ہی سر پر لے لے - یا آنکھیں چرا
کر دوڑتی ہوئی گھر کی سیڑھیاں ہی اُتر جائے ——— اگر وہ
بن ٹھن کر گھر کے دروازے سے باہر نکلے - تو گلی محلّہ میں بیٹھی ہوئی عورتیں
اسے احترام سے تو دیکھ سکیں گی - لیکن چونکہ نہیں ذرا سی جنبش یا
ذرا سی لرزش بھی تو پیدا نہیں ہو سکے گی ان میں - بس یُوں جیسے گلی
میں سے کوئی بے چارہ "شریف سا گائے کا بچھڑا چلا جا رہا ہو - اور
زبانِ حال سے کہہ رہا ہو ——— "اگرچہ تم نے اچھا نہیں کیا - کہ
میرے گلی میں اترنے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی - لیکن اس میں
تمہارا بھی کیا قصور ہے - تمہارے دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کرنے کے
لئے میری کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی"
سیاسی اعتبار سے شاید وہ کسی بھی مدرسۂ فکر کا قائل نہیں ہے
شاید یہ فیصلہ میں نے اس لئے کیا کہ وہ اپنی گفتگو میں سنجیدگی اور
یقین کا رنگ لانے ہی نہیں دیتا - آپ اس کے ساتھ سیاست پر گفتگو
کریں - تو وہ اسے مذاق میں اڑانا شروع کر دیگا - لیکن اس مذاق میں
بھی اگر کوئی آدمی یہ اندازہ لگانا چاہے کہ جونہی اسے کیور کی سیاسی گفتگو

ہیں کسی ایک لمحے کے لئے بھی قدرے اعتماد اور عنایت کی جھلک مل جائے۔ تو وہ اس کے اصلی سیاسی رجحان کو سمجھ سکے۔ تو وہ ناکام رہے گا۔ کیونکہ کپور ایسا موقعہ آنے ہی نہیں دیتا۔ میں نے خود کئی مرتبہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ مگر کپور کی طرار مزاجی اور رسیلانی مذاق نے مجھے کسی مقام پر ٹھہرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں نے کتنے ہی اندازے لگا لگا کر چھوڑ دئے۔ کبھی میں سوچتا کہ اس نے ایک نہایت ترقی پسندانہ بات کہی ہے۔ اس لئے وہ شاید کمیونزم کا حامی ہوگا۔ کبھی سوچتا۔ ہاں اب وُہ ذرا ذرا سوشلزم کی طرف جھکتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ کبھی سوچتا وہ ہندو سبھا کے متعلق باتیں کرتے ہوئے یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ کانگرسی خیالات رکھتا ہو کبھی مسلم لیگ کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کا جھکاؤ راشٹریہ سنگھ کی طرف دکھائی دینے لگتا ——— لیکن نتیجہ ہمیشہ صفر ہی نکلتا۔ وہ ہر تحریک پر تبصرہ کرتا اور یوں جیسے ان سبھوں کو چٹکیوں میں اُڑا رہا ہو ——— اس لحاظ سے اس کی یہ غیر جانبداری اسے بورژوا سیاست گری کا ہتھیار بنا لیتی ہے۔

مذہب کے متعلق کپور کے خیالات دو تین فقروں میں سموئے جا سکتے ہیں ——— آپ اس کی ہیئت کذائی دیکھیں۔ جبکہ اس نے مخصوص دھوتی پہن رکھی ہو۔ تو کوئی مہا پنڈت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن "ہندتائی" سے وہ اتنا ہی دُور ہے۔ جتنا کوئی کافر خدا سے ہو سکتا ہے

اس کا خیال ہے کہ مذہب بیوقوفوں کے لئے ہے۔ کیونکہ کسی بھی مذہب میں کوئی ایسی بات نہیں بتائی جاتی جسے ایک ذہین آدمی پہلے سے نہ جانتا ہو۔ اس لئے ذہانت مذہب کی محتاج کبھی نہیں رہی ہے۔ ہاں بے وقوفوں کو مذہب کے توسط سے بڑی کامیابی کے ساتھ پھانسا جاسکتا ہے۔

جب کبھی اُسے خُدا کے متعلق گفتگو کرنے کا موقع مِل جائے ــــــ تو اس کا طنز بہت بیباک ہو جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ اس ان دیکھی چیز سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہر شخص کے چہرے کو خدا نے مسخ کر ڈالا۔ صرف اس لئے تاکہ ذرا تنوّع پیدا ہو جائے۔ اس لحاظ سے ہر شخص کی رسوائی کا باعث دوستوں سے پہلے خدا ہی ہے۔ آدم و حوا کو اگر خدا نے جنت سے صرف اسی لئے نکلوا دیا کہ انہوں نے گندم کا ایک آدھ دانہ کھا لیا تھا۔ تو ان کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہؤا۔ اور اس جُرم کے لئے خُدا کو چاہئے۔ کہ وہ اپنے آپ کو فراخدلی کے ساتھ معاف کر دے۔

جب لاہور میں فسادات انتہائی عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اور وہ گھر میں مقید رہتا تھا۔ تو میں قریباً ہر روز اس سے ملا کرتا تھا۔ وہ اپنی نشست گاہ کے اُسی مخصوص صوفے پر دھوتی پہنے ہوئے، سگرٹ پیتے ہوئے دکھائی دیتا اور اس کے چہرے پر ایک اطمینان دکھائی دیتا۔ جیسے ہندوستان کی تاریخ میں کوئی واقعہ ہو ہی نہیں رہا ہنس ہنس کر، قہقہے لگا لگا کر وہ باتیں کرتا رہتا محلے کے لوگ نہایت وحشت انگیز

اور خوفناک خبریں آ کر سُناتے ۔ لیکن اس کے چہرے پر شکن تک نہ آتی ۔
جیسے وہ تاریخ کے اس عظیم ترین حادثے کو صرف ایک مذاق سمجھ رہا ہو۔
ممکن ہے اس لرزہ خیز وقت میں جب کہ فسادیوں سے ہر لمحہ خطرہ کا
امکان ہو سکتا تھا ۔ وہ رات کے کسی لمحے میں بیوی کے دباؤ پر چند
ایک منٹ کے لئے سوچ لیتا ہو ۔ کہ ہاں ! انہیں جان بچا کر بھاگ
جانا چاہیئے ۔ لیکن عام طور پر اس کی پیشانی متبسّم رہتی ۔ شاید کہنا چاہتا
ہو ۔ کہ موت سے ڈرنا کس قدر بے معنی ہے ۔ انسانی بربریت سے
گھبرانا جہالت ہے ۔ اگر وہ مر بھی جائیگا ۔ تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑیگا ۔
آخر زندگی اس قدر کشش انگیز اور جاذب چیز تو ہے نہیں کہ اس
کی خاطر اپنی اطمینان بخش مسکراہٹ کو بھی مار دیا جائے ـــــــــــــــ

اس لئے کپور کے بیان کے مطابق اس نے اپنا سامان کئی مرتبہ باندھ باندھ
کر گلی میں لا رکھا ۔ اور شام کو پھر اندر لے گیا ۔ اور کھول دیا ۔ صبح پھر باندھ
کر گلی میں لا رکھا اور شام کو پھر اندر لے جا کر کھول دیا ــــــــــ اور
بالآخر جب وہ گھر چھوڑ کر ایک ٹرک پر سوار ہوا ۔ تو اپنی قیمتی سے قیمتی
کتابوں کے ٹرنک گھر ہی پر چھوڑ آیا ۔ کیونکہ اس کی بیوی کی نگاہیں
کہہ رہی تھیں ۔ گھریلو برتن ، بستر اور کپڑے ان کتابوں سے زیادہ
کارآمد چیزیں ہیں ۔ چنانچہ اس نے بیوی کی نگاہوں کو اپنی خواہشات
کا مرکز بنا لیا ۔ اور کتابوں کے بجائے گھر کا سامان ہمراہ لے آیا ۔

لاہور جیسے مہذب ، مکمل رنگین اور ہنگامہ خیز شہر کو چھوڑ کر وہ کہاں

چلا گیا؟ کتنے ہی مہینوں تک کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ کہ کپور کہاں گیا ہے۔ نہ جالندھر میں نہ دہلی میں، نہ شملہ میں۔ کیا وہ کسی دور دراز گاؤں میں چلا گیا ہوگا؟ میں نے سوچا۔ اس مسخرے سے کوئی بعید نہیں کہ وہ کسی ایسے ہی اوٹ پٹانگ مقام پر چلا گیا ہو۔ جہاں بقول غالب ع

"کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو"

ایک دن پرکاش پنڈت نے مجھے بتایا کہ کپور موگا میں ہے۔ یا مظہر العجائب کتنا کوتہ ہمت شخص ہے یہ۔ موگا؟ بھلا یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہو سکتی ہے؟ لیکن پھر میں نے سوچا کہ اس کی کوتہ ہمتی، ہماہمی سے بیزاری اور فسادات کی وحشیانہ حرکات نے اُسے اور بھی بجھا کر رکھ دیا ہوگا۔ وہ پہلے بھی کچھ کم بجھی ہوئی شخصیت نہیں تھا۔ بقول کرشن چندر وہ ایک قبر تھا۔ جس پر پھول چڑھانے کے بھی کوئی نہیں آئے گا۔۔۔ اسی لئے وہ لاہور چھوڑ کر موگا کے قبرستان میں جا بسا۔ موگا جہاں کوسوں تک ادب، کلچر، سوسائٹی، علم، آرٹ کی پرچھائیں تک دکھائی نہیں دیتی۔ وہاں وہی چند بندھے ٹکے یسکرٹے سمٹے پروفیسر ہونگے۔ بجھے بجھے طالب علم ہونگے۔ اور کپور کے NOTES ہونگے۔ اور بس وہ قہقہے اور چہچہے جن سے لاہور کی ادبی اور کلچرل فضائیں معمور رہتی تھیں۔ کپور ان سے دامن چھڑا کر گوشہ عافیت میں جا بسا ہے۔ اگرچہ وہ اب بھی سوچتا ہے کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ لیکن یہ سوچنے کے باوجود وہ کچھ نہیں کرتا۔ ندامت اور مقابلہ کی قوت سے تو وہ ازلی

طور پر محروم ہے۔ اس لئے اُسے ایسا کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ وُہ شاید زندگی سے بھاگ کر پناہ ڈھونڈھ چکا ہے۔ شاید اس میں یہ جرأت نہیں کہ ملازمت کے لئے سفارش اور رشوت مہیّا کر سکے۔ مکان کے لئے الاٹمنٹ آفیسروں سے لڑ جھگڑ سکے۔ ادبی محاذ میں دوبارہ اُلجھ سکے۔ اور کسی کلچرل شہر کی ہنگامہ خیز زندگی میں اپنے آپ کو جھونک دے۔

لیکن ——— اس فرار کے باوجود وہ اپنی فطرت کے طنزیہ اُبھار کو مار نہیں سکتا۔ وہ لاکھ ایک امن پسند شہری سہی، لاکھ ایک شریف اور بندھا ٹکا خاوند سہی لیکن موگا جیسے بے جان کنجِ تنہائی میں جا کر بھی وہ ادب اور تمدّن سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکا۔ موگا میں بیٹھ کر ہی اس نے پھر طنزیہ مضامین لکھنے شروع کر دئے۔ اور ایک بار پھر زندگی کے ساتھ نئے نئے مذاق کرنے لگا۔ آج بھی اگر اُسے کہیں سے کسی مشاعرے یا ادبی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جائے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو گھریلو معاملات میں کھو جانے کی سنگین کوشش کر کر کے اپنے دل کی اس دھڑکن کو بند کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہی دھڑکن تو اس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ وہ اسے کیونکر روک سکتا ہے۔ گذشتہ دنوں جب میں نے اُسے جالندھر کے ایک مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ تو اس نے لکھا۔

"میری ساس مر گئی ہے۔ کالکا جا رہا ہوں"۔ اور تم جانتے ہو۔ کہ یہ کم بخت ساسیں روز روز تو مرا نہیں کرتیں۔ اس لئے تمہارے

مشاعرے میں شرکت سے معذور رہوں ۔"

ساس تو مرتی رہی ۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ وہ ہمارے مشاعرے کی صدارت کے لئے جالندھر آدھمکا ۔ یہاں تک کہ اس نے اسٹیشن پر اپنے استقبال کی بھی پروانہ کی ۔ اور بغیر ہمارا انتظار کئے میرے گھر آرہا ۔ اور پھر رات کے تین تین بجے تک ہم لوگ کپور کے وہی مانوس قہقہے وہی بے ساختہ مسکراہٹیں پھبتیاں اور طنزیہ جملے سنتے رہے ۔ وہ متواتر بولتا رہا ۔ ادب پر ۔ آرٹ پر ۔ سیاست پر ۔ ادبی شخصیتوں پر گہری اور نفیس چوٹیں کرتا رہا ۔ ہم سب کو جماہیوں پر جماہیاں آتی رہیں ۔ لیکن وہ ان جماہیوں کی پروا کئے بغیر تین بجے رات تک چہکتا رہا ۔ جیسے اسے پھر نئی زندگی مل گئی ہو ۔ جیسے اسے پھر اپنا پرانا مقام مل گیا ہو ۔

وہ ایک بہت بڑا سکیم باز بھی ہے ۔ عمل سے گریز اور فرار نے اسے ذہنی عمل کا راستہ سجھا دیا ہے ۔ اس لئے اس کا ذہن سکیمیں تیار کرتا رہتا ہے ۔ یہ سکیمیں نہایت عجیب و غریب ہوتی ہیں ۔ اگرچہ یہ سکیمیں بیان کرتے وقت وہ ذرا بھر بھی سنجیدہ دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر اس گفتگو میں سے مذاق کے عنصر کو نکال دیا جائے ۔ تو اس کی سکیموں میں ایک جدت اور خاص عملی رنگ بھی ہوتا ہے ۔ لاہور کے کئی ادبی پبلشر اس کی سکیموں کے دلدادہ و شیدا رہے ہیں ۔ یہ سکیمیں اس کے دماغ میں پوری مکمل شکل میں کبھی نہیں آئیں ۔ بلکہ سب سے پہلے مذاق

کے طور پر وہ صرف ایک تجویزی فقرہ بولتا ہے۔ اور پھر وہی تجویزی فقرہ
اس کے دماغ میں پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ بولتا چلا جاتا ہے۔ اور
فقرہ بھی پھیلتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بہت بڑی سکیم کے
روپ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے۔ بات سے بات کرنے کے فن کا
وہ ماہر ہے۔ اور ان باتوں کے دوران میں اس کے چبھتے ہوئے جملے
اس کی سکیم پر جلا کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی اس سکیم کو طنز کے تخریبی
انداز میں پیش کرتا رہتا ہے۔ اور گویا اس کا تخریبی انداز کہہ رہا ہوتا
ہے کہ ع

"مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

وہ تخریب کے زاویہ سے تعمیر کی راہ دکھاتا ہے۔ کیونکہ اس نے
زندگی کو ہمیشہ اسی زاویہ سے دیکھا ہے۔ اور اسی زاویہ سے پیش کرنا
ہی اس کے فن کا خاص رنگ ہے۔

ادبی اعتبار سے وہ سٹیفن سن سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن
اسے جب یہ خیال آتا ہے کہ سٹیفن سن تپ دق سے مرا تھا۔ تو اس کی
مشابہت سے قدرے گھبرا جاتا ہے۔ اور سوچتا ہے۔ وہ سٹیفن سن کبھی
نہیں ہے ـــــــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس گھبراہٹ کے باوجود
اسے سٹیفن سن کی آخری روایت یعنی تپ دق سے بھی ضرور تعلق رکھنا پڑیگا۔

ـــــــ اس کا خیال ہے کہ اردو ادب میں باوجود اس درجہ ترقی
پسندی کے غوغا کے ابھی بات نہیں بنی۔ ادب اگر بلند پایہ نہیں تو کچھ بھی

نہیں ۔کیونکہ ایک تاج محل ، سینکڑوں جھونپڑیوں پر بھاری ہے ۔
تاج محل والی تشبیہہ اگرچہ خوبصورت ضرور ہے ۔ لیکن میرا خیال ہے
کہ .... مگر میں کپور کی تشبیہہ پر کیوں بحث کر کے سر کھپاؤں ۔
کیا اس سر کھپائی سے سینکڑوں جھونپڑیاں تاج محل میں بدل جائینگی ؟
پُرانے شاعروں میں سے اسے غالبؔ سے عشق ہے ۔ اسے صرف
غالبؔ ہی کے شعر یاد ہوتے ہیں ۔ غالبؔ جیسے سنجیدہ شاعر کے کلام کو
کپور جیسے پھکڑ اور طنز نگار کے ہاں دیکھ کر تعجب تو ضرور ہوتا ہے ۔ لیکن
کپور کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ اپنی طنزیہ گفتگو میں غالبؔ کے
شعروں کے حوالے کچھ اس طرح دے جاتا ہے ۔ کہ یوں محسوس ہونے لگتا
ہے جیسے غالبؔ کے شعروں کی سنجیدگی پر کپور کے طنزیہ حوالوں نے ڈاکہ
ڈال لیا ہے ۔ اور غالبؔ نے شاید کپور کی ڈاکہ زنی کے لئے ہی اپنا سارا
دیوان ترتیب دیا تھا ۔ اس کے مضامین کے سب سے پہلے مجموعے کا نام
بھی غالبؔ ہی کے دیوان سے لیا گیا تھا ۔ یعنی "سنگ و خشت" اس کے
بعد سنگ و خشت کی رعایت سے جب اُسے غالبؔ کے ہاں سے اور
کوئی ترکیب نہ مل سکی ۔ تو اس نے غالبؔ کے دیوان کی اس افسوسناک
کمی کو خود ہی پورا کر دیا ۔ اور اپنے دوسرے مجموعے کا نام بھی "سنگ و
خشت" کی تقلید میں "شیشہ تیشہ" اور "چنگ و رباب" ہی رکھے ۔
اور غالبؔ پرستی کا یہ تقلیدی سلسلہ مرتے وقت تک اس کا پیچھا نہیں
چھوڑے گا ۔

کرشن چندر کی طرح اس نے چند دِنوں تک فلمی ماحول کا رُخ ضرور کیا تھا۔ اس کے لئے اس نے بمبئی اور کلکتہ کا سفر بھی کیا تھا۔ لیکن اس سفر سے اُسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ سوائے ایک دو مضامین کے جو اس نے ان شہروں پر لکھے۔ ورنہ دو ایک فلموں کے جو مکالمے اس نے لکھے ان میں تو فلم کے ڈائرکٹروں' فلم کی خوبصورت ہیروئینوں اور پروڈیوسروں کے محبوب ڈرائیوروں نے ہی تبدیلیاں کرکر کے اُن کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اور جب فلم کی شوٹنگ کے وقت کپور کو اسٹوڈیو میں لے جایا جاتا۔ تاکہ وہ صحیح مکالمے کی نگرانی کر سکے۔ تو کپور سوائے اس کے اور کچھ نہ کرتا۔ کہ وہاں سیٹ پر فلم کے ڈائرکٹر۔ ہیروئن اور پروڈیوسر کے ڈرائیور کے حسنِ مذاق پر عش عش کر اُٹھتا۔ اور انہیں داد دے دے کر کہتا۔ کہ آپ نے اس ڈرامے کے فلاں مکالمے اور فلاں فقرے کو بدل کر اس میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ مجھے آپ کی اس تبدیلی پہ ناز ہے۔

آجکل اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ آئندہ کسی بھی فلم کے مکالمے نہیں لکھے گا۔

مجھ سے ملئے ۔ میرا نام .... خیر چھوڑیئے ۔ نام میں کیا رکھا
ہے ۔ میرا شغل ؟ میرا شغل لوگوں کو سبز باغ دکھانا ہے ۔ حیران مت ہوجئے
آخر ہم میں سے ہر ایک یہی کچھ تو کرتا ہے ۔ لیڈر بھولے بھالے عوام کو سبز
باغ دکھاتا ہے ۔ عاشق محبوبہ کو ۔ ڈاکٹر مریض کو ٹیکنیک میرا یہ ہے کہ میں
ہمیشہ ان لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں ۔ جو زندگی سے نالاں اور جن
سے زندگی نالاں ہے ۔ باتوں باتوں میں بے تکلفی کی فضا پیدا کرنے کے
بعد انہیں عجیب و غریب مشورے دینے لگتا ہوں ۔ حیرانی کی بات یہ ہے
کہ پانچ میں سے کم از کم تین میرا مشورہ قبول کر لیتے ہیں .....

"آپ پروفیسر ہیں" میں کسی خستہ حال پروفیسر کا ہاتھ اپنے ہاتھ
میں لیتے ہوئے کہتا ہوں ۔ "ہاں پروفیسری بھی کوئی پیشہ ہے ۔ اُونچی

دکان پھیکا پکوان۔ یعنی نام بڑا درشن چھوٹے! مہینہ بھر کالج میں بکواس کیجئے اور تنخواہ صرف ایک سو پچاس روپے۔ یعنی اگر حساب لگایا جائے۔ تو فی لیکچر ایک روپیہ! آپ سے زیادہ تو مسمریزم کا کھیل دکھانے والے کما لیتے ہیں۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے۔ اور پھر آپ کا مستقبل کیا ہے۔ ذرا اس پر بھی غور کیجئے۔ تیس برس ملازمت کیجئے اور پھر چپکے سے ریٹائر ہو جائیے۔ اور اس کے بعد؟ سڑکیں ناپیے۔ ہوا کھائیے۔ پنشن تو آپ کو ملنے سے رہی۔ بڑا زور مارئیے۔ تو کسی خیراتی شفاخانے میں داخل ہو جائیے۔ اور دق زدہ پھیپھڑوں کا علاج کرائیے۔ آپ نے یہ بھی سوچنے کی زحمت کی کہ ہمارے سماج میں ایک پروفیسر کی وقعت کیا ہے۔ لونڈے لونڈیاں آداب تک تو بجا نہیں لاتیں۔ بازار میں کسی لونڈے سے ملاقات ہو جائے تو وہ شرم سے سر جھکا لیتا ہے۔ کہ ہے بھی کیا بچارا۔ پھٹی ہوئی پتلون۔ میلا کوٹ اور الٹی فیلٹ پہنے پروفیسر صاحب جا رہے ہیں۔

یہ آپ کو سوجھی کیا۔ کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ پروفیسر بن بیٹھے صاحب اگر فلم انڈسٹری میں جاتے۔ ریڈیو کے محکمے میں ہوتے۔ کوئی بات بھی تھی۔ میری بیسیوں پروفیسروں سے شناسائی ہے۔ ان میں سے اکثر پڑھتے پڑھاتے بینائی سے محروم ہو چکے ہیں۔ جب ملتے ہیں۔ کہتے ہیں: "میاں تم نے اچھا کیا۔ پروفیسر نہ ہوئے۔ ورنہ دنیا کے رہتے نہ دین کے۔ خیر صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے

میری مانئے۔ تو آج ہی استعفےٰ دے دیجئے۔ کسی فلم کمپنی میں کوشش کیجئے۔ آپ کی لیاقت سے مرعوب ہو کر درجنوں کمپنیاں آپ کو ملازم رکھ لیں گی۔ ایک بار فلم انڈسٹری میں پہنچ گئے۔ بس پھر مزے ہی مزے ہیں۔ شاندار کوٹھی میں رہیئے گا۔ موٹر میں گھوما کیجئے گا۔ اور روپیہ اتنا کمائیے گا۔ کہ آپ کی سات پشتیں اُسے آسانی سے ختم نہ کرسکیں گی۔

" اخّاہ! آپ وکیل ہیں۔ تبھی یہ حالت بنا رکھی ہے۔ بخدا (معاف کیجئے گا) دُور ہی سے نہیں، نزدیک سے بھی اچھے خاصے کباڑی نظر آتے ہیں آپ۔ وکیل صاحب وہ دن لد گئے۔ جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ یعنی جب وکیل وکیل ہوتے تھے۔ آج کل تو وکالت صرف دُور کے ڈھول ہو کر رہ گئی ہے۔ آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا جاتی ہیں۔ اور موکل نظر نہیں آتا۔ آپ کے سے لائق آدمی کو تو انشورنس ایجنٹ ہونا چاہئیے تھا۔ بس وارے نیارے ہو جاتے۔ مہینے بھر میں اگر ڈیڑھ سو کیس بھی کمپنی کو دیتے۔ تو دو ہزار کمیشن بنتی۔ آپ بن بیٹھے وکیل۔ آمدنی صفر۔ خرچ بے حساب۔ نتیجہ پریشانی۔ اجی وکیل صاحب! وکالت بھی کسی کسی قسمت والے کی چلتی ہے۔ ورنہ اکثر تو گھر سے کچہری، اور کچہری سے گھر کے چکر میں ہی پڑے رہتے ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہزاروں ایسے کام ہیں جو آپ کر سکتے ہیں۔ لیکن کرنا نہیں چاہتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ وکالت کا چسکا جو پڑ گیا ہے۔ بس اس پہ اِترا رہے ہیں۔ کہ لوگ آپ کو وکیل صاحب کہتے ہیں۔

ارے بھئی، لوگوں کا کیا ہے - اگر آپ وکیل کے بدلے ڈاکٹر ہوتے - تو آپ کو ڈاکٹر صاحب کہہ دیتے - سوال تو یہ ہے - کہ اوسطاً آپ کے پلے کیا پڑتا ہے - میرا تو اندازہ ہے - مشکل سے پچاس روپے - پچاس روپے! یہ رقم تو آپ ایک مضمون لکھ کر کما سکتے ہیں - لعنت بھیجئے وکالت پر - مضمون لکھا کیجئے - آم کے آم گٹھلیوں کے دام - روپیہ الگ آئے گا - اور نام مفت میں چمک جائیگا - ایک بار ہمت سے کام لے کر وکالت کا لائسنس منسوخ کرا لیجئے - پھر ذرا خدا کی شان دیکھئے - کیا کہا آپ نے - وکالت نہیں چھٹتی - بھئی خوب - وکالت نہ ہوئی - دخترِ رز ہوئی - آپ کچہری جانا بند کیجئے - وکالت اپنے آپ چھوٹ جائے گی -

" آپ کلرک ہیں - اسے کہتے ہیں قدرت کی ستم ظریفی - بھلا آپ کو دیکھ کر کوئی کیسے مان لے کہ آپ کلرک ہیں - بخدا بھلے چنگے بلکہ خاصے انسان نظر آتے ہیں - قد و قامت مناسب ہے - شکل و صورت بھی بُری نہیں - آپ کو کس بے وقوف نے مشورہ دیا - کہ کلرک بن جائیے - کلرکی تو قید با مشقت ہے - قید محض بھی نہیں - سارا دن دفتر میں بیٹھ کر جھک ماریئے - افسروں کی گھرکیاں سہیئے - اور رات کو فائیلوں پر جھک جھک کر اپنی صحت تباہ کیجئے - بندہ پرور! آپ کس مخمصے میں پھنس گئے - دیکھئے اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں - ورنہ مجھے کیا ضرورت کہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑاؤں - کلرک سے بدتر انسان میرے

دیکھنے میں نہیں آیا۔ اعداد و شمار سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تپ دق کے
اسّی فی صدی مریض کلرک ہوتے ہیں۔ یعنی کلرکی تپ دق کا دوسرا نام ہے۔
ایک لمحہ کے لئے سوچئے۔ خدانخواستہ آپ کو دق ہو جائے۔ آپ کے متعلقین
کا کیا بنے گا۔ یہی ناکہ وہ بے چارے گھل گھل کر مر جائیں گے۔ میں نے سنا
ہے آپ شاعر بھی ہیں۔ ہاہاہا۔ کلرک اور شاعری! بھلا آپ خاک شعر
کہتے ہونگے۔ شعر کہنے کے لئے فراغت چاہئے۔ فرصت کے رات دن! یہاں
نہ دن تمہارا نہ رات تمہاری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے آپ کو راز کی بات بتاؤں۔
آجکل لانڈری کا کام بہت نفع بخش ہے۔ چپکے سے لانڈری کا پلانٹ
خرید لیجئے۔ اور اسے ایسی جگہ لگائیے۔ جہاں آمد و رفت عام ہو۔ بس،
کپڑے صاف کیا کیجئے۔ اور شعر کہا کیجئے۔ اگر راتوں رات امیر نہ بن جائیں
تو میرا نام بدل دیجئے گا۔ لانڈری تو بندہ نواز الہ دین کا چراغ ہے۔ یہی
افسر لوگ جو آپ پر رعب گانٹھتے ہیں بھاگم بھاگ آئیں گے اور گڑگڑا
کر کہیں گے "منہ مانگے دام لیجئے۔ لیکن اس سوٹ سے نیلی روشنائی کے
دھبے دور کر دیجئے"۔ بخدا اس وقت تگنے دام طلب کیجئے گا۔ اور دل
ہی دل میں خوش ہو کر کہئے گا "کیوں صاحب بہادر! بڑا رعب جماتے
تھے ہم پر۔ آج چڑھے نا ہمارے ہتھے۔ کہو تو یہ سوٹ تباہ کر کے رکھ
دوں" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جب یہ لوگ میرے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے
پروفیسری وکالت یا کلرکی چھوڑ کر بے کار ہو جاتے ہیں۔ اور تابڑ توڑ

کوششوں کے باوجود بہتر ملازمت حاصل کرنے میں ناکامیاب رہتے
ہیں اور نہایت مایوسی کے عالم میں میرے پاس آکر شکایت کرتے ہیں۔
کہ انہیں ہر دروازے سے بے نیل و مرام واپس آنا پڑا ہے۔ تو میں
انہیں پہلے سبز باغوں سے زیادہ دلکش سبز باغ دکھانے لگتا ہوں۔
"آپ کو کسی فلم کمپنی نے ملازم نہیں رکھا؟ مجھے ذرا بھر بھی تعجب نہیں
آپ پروفیسر ہیں۔ پڑھے لکھے سمجھدار آدمی ہیں۔ لکھنے کا فن جانتے
ہیں۔ بس یہی آپ کا سب سے بڑا جرم ہے۔ اگر آپ ان پڑھ ہوتے۔
آپ کا مذاق از حد پست ہوتا۔ آپ صحیح زبان لکھ نہ سکتے۔ تو آپ کو فوراً
ملازم رکھ لیا جاتا۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا۔ کہ کام کے عوض آپ کو "جواب"
ملا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ بسکٹ فیکٹری قائم کر لیجئے۔ زیادہ
سرمائے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے۔ دو تین ہزار سے کام چل جائیگا۔
آپ تو پروفیسر رہے ہیں۔ سینکڑوں طلبا آپ کو جانتے ہونگے۔ اور
طلبا کو بسکٹ کھانے کا جو شوق ہوتا ہے۔ وہ آپ سے مخفی نہیں۔ دیکھئے
اگر آپ پانسو میں سے تین سو طلبا بھی آپ کے مستقل گاہک بن جائیں۔
تو آپ ایک ہزار روپیہ ماہوار کما سکتے ہیں۔ یہ کام آپ کو پسند نہیں
غضب کرتے ہیں آپ۔ معلوم ہے آپ کو ڈی سی ڈی۔ ڈڈوانی نے
اسی کام سے لاکھوں کمائے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ بسکٹ بنانے
سے پہلے وہ ایک معمولی سکول ماسٹر تھا۔ اگر ایک سکول ماسٹر جس کی
ذہانت آپ کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے لکھ پتی بن سکتا ہے۔

تو آپ کیوں نہیں بن سکتے۔ اچھا چھوڑیئے۔ مَیں آپ کو اس سے بہتر کام بتاتا ہوں۔ آپ اخباروں کے لئے اشتہارات اکٹھا کیا کیجئے۔ اگر ایک ماہ میں آپ پچاس ہزار کے اشتہارات فراہم کرلیں۔ تو ان پر آپ کو پچیس فی صد کمیشن ملے گی۔ یعنی ساڑھے بارہ ہزار۔ اسے کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔ بڑی بڑی فرموں کے پاس جایئے۔ موٹروں کی فرمیں ہیں۔ چائے کی فرمیں ہیں۔ دواؤں کی فرمیں ہیں۔ اور ہاں فلم انڈسٹری ہے۔ پچاس ہزار کے اشتہارات حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ کام بھی آپ نہیں کرنا چاہتے؟ تعجب! اچھا تو پالتو کتے بیچنے کا کام کیسا رہے گا؟ مانا کہ انگریز چلے گئے ہیں۔ راجاؤں اور نوابوں کا دور ختم ہوا۔ لیکن پالتو کتوں کے اب بھی ہزاروں گاہک ہیں۔ کہیں سے اچھی نسل کے چند کتے لے آیئے اور پھر ہندوستان کے ہر اخبار میں اشتہار دے ڈالئے کہ بہترین نسل کے کتے صرف آپ سے مل سکتے ہیں۔ ایک ایک کتے کے دو دو ہزار وصول کیجئے۔ اگر دس کتے بھی بک جائیں۔ تو بیس ہزار روپیہ آپ کی جیب میں آجائے گا۔ آپ ناک بھوں چڑھا رہے ہیں۔ یہ کام بھی ناپسند ہے۔ اچھا تو آپ یوں کیجئے۔ کسی امیر بیوہ سے شادی کر لیجئے۔ آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ اور گلچھرے اڑایئے گا۔ آپ شادی شدہ ہیں؟ اتنی جلدی آپ نے شادی کی ہی کیوں؟ خیر تو آپ یہ کیجئے۔ کہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جتنی لاٹریاں نکلنے والی ہیں۔ ان سب کے ٹکٹ خرید لیجئے۔ آخر کوئی تو آپ کے نام نکلے گی۔ ٹکٹ خریدنے کے لئے آپ کے

پاس پیسے نہیں؟ اچھا تو آپ یہ کیجئے ——— یہ کیجئے ———
یہ کہ ——— دراصل اس وقت دماغ کام نہیں کر رہا۔ آپ کسی اور
وقت تشریف لایئے۔ میں سوچ کر بتاؤنگا۔ بہرحال مایوس ہونے کی قطعی
ضرورت نہیں۔

——— اور پھر کسی دن جب میں انہیں طرح طرح کے
سبز باغ دکھا رہا ہوتا ہوں۔ تو وہ کسی باغ کی خوبصورتی و رعنائی سے
مرعوب ہوکر خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔ لیکن جب سبز باغ آخر سبز
باغ ثابت ہوتے ہیں۔ تو وہ گھبرا کر پھر میرے گھر کا رُخ کرتے ہیں۔
اور میں سبز باغوں کا سلسلہ از سرِ نو شروع کر دیتا ہوں۔ اُردو اخبار
کے لئے گپ شپ کا کالم لکھا کیجئے۔ ——— پن چکی لگا لیجئے ———
فلمی رسالہ نکالئے ——— مرغی خانہ کھول لیجئے ——— کسی سیٹھ
کا متبنیٰ بن جایئے ——— انڈیمان چلے جایئے ——— بمبئی
میں چائے کی دکان کھول لیجئے۔

حتّٰی کہ تنگ آ کر وہ سوچنے لگتے ہیں۔ کہ پروفیسری۔ وکالت اور
کلرکی تو ان سبز باغوں سے کہیں بہتر تھی۔

کاٹھ کا اُلّو

اب جبکہ سیٹھ کچومرمل کی کامیابی کی خبر اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بتادیا جائے کہ وہ ہمارے حلقے سے پارلیمنٹری انتخابات میں کامیاب کس طرح ہوئے سیٹھ کچومرمل عمر انداً پچپس سال (لیکن معلوم اُنچاس کے ہوتے ہیں) ایک آنکھ اصلی ۔ ایک مصنوعی چہرہ لمبوترا۔ وضع قطع غیر شریفانہ ۔لباس عموماً غلیظ ۔جس سے لہسن اور ہینگ کی ملی جلی بُو آتی ہے ۔تعلیم صفر۔پیشہ کوئلہ ۔چونا اور اینٹوں کی خرید وفروخت ۔سیٹھ صاحب موصُوف ہمارے حلقے سے بطور آزاد اُمیدوار کھڑے ہوئے تھے ۔کسی پارٹی کے ٹکٹ پر اس لئے کھڑے نہ ہو سکے کہ پارٹی دفتروں کے بجائے یہ ڈاک خانوں اور ریلوے اور سینما ٹکٹ گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے ۔ان کا خیال تھا کہ الیکشن

کے ٹکٹ ان جگہوں سے دستیاب ہوتے ہیں۔

یکم نومبر کی رات کے دو بجے جب ساری دُنیا مزے کی نیند سو رہی تھی۔ سیٹھ صاحب کو الہام ہوا۔ کہ انہیں پارلیمنٹ کے لئے کھڑا ہونا چاہیئے۔ یہ الہام کچھ اس شدّت سے ہوا کہ آپ اپنے بستر پر سر کے بل کھڑے ہو گئے۔ اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک کہ تھک کر پھر بستر پر نہ گر پڑے۔ دوسرے دن انہوں نے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دائے۔

یہ اسی دن ۱۱ بجے کا ذکر ہے کہ آپ کی ملاقات مجھ سے سرِ راہ ہوئی۔ کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آتے تھے۔ میں نے پوچھا "سیٹھ صاحب! کیا بات ہے؟" بھنّا کر کہنے لگے "عجیب مصیبت ہے یہ بھی"

"کیا عجیب مُصیبت ہے؟"

"یہ الیکشن کے لئے نشان مُنتخب کرنا"

"آپ کو الیکشن سے کیا۔ آپ مزے سے کوئلہ بیچیے۔ نشان مُنتخب کرنے والے کرتے رہیں گے"

"کوئلہ تو ہر روز ہی بیچتا ہوں۔ لیکن الیکشن تو روز روز نہیں آتے"

"خدانخواستہ کہیں آپ الیکشن کے لئے تو کھڑے نہیں ہو رہے؟"

"ہو نہیں رہا۔ ہو گیا ہوں۔ ابھی ابھی کاغذات داخل کر کے آیا ہوں"

"لیکن آپ اور الیکشن"؟

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جب چمڑا بیچنے والے۔ جوتا چرانے والے۔

بوٹ پالش کرنے والے الیکشن کے لئے کھڑے ہو رہے ہیں تو کوٹھے بیچنے والے سیٹھ کچومل نے کیا پاپ کیا ہے کہ وہ ـــــــــ "

" بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اچھا ـــــــ تو مبارک باد قبول فرمائیے "۔

" مبارک باد تو بعد میں دیکھی جائے گی۔ پہلے یہ بتائیے کہ نشان کون سا چنا جائے"؟

" کوئی بھی چن لیجئے۔ درجنوں "نشان" ہیں "۔

" مثلاً "

" ڈگڈگی کے متعلق کیا خیال ہے "؟

" نشان تو اچھا تھا۔ لیکن کم بخت مداری لال نے چن لیا "۔

" ریچھ "

" یہ بھی منتخب کیا جا چکا ہے "۔

" لنگور "

" اس کے متعلق تو دو اُمیدواروں میں خاصہ جھگڑا ہو چلا تھا۔ آخر قرعہ اندازی سے فیصلہ ہُوا "۔

" بارہ سنگھا "۔

" یہ کوئی اچھا نشان نہیں "۔

" لگڑ بگڑ "

" بہت خونخوار نشان ہے "۔

میں نے سیٹھ صاحب کو بیسیوں نشان بتائے۔ لیکن انہیں کوئی پسند نہ آیا۔ آخر میں مَیں ان سے یہ کہہ کر رخصت چاہی کہ شام کو سوچ کر بتاؤنگا۔

سارا دن اسی اُدھیڑ بُن میں رہا۔ کہ سیٹھ صاحب کے لئے کونسا نشان موزوں رہے گا۔ سیٹھ صاحب سے میری پُرانی رسم و راہ تھی۔ اور میں نہیں چاہتا تھا۔ کہ انہیں مایوس کروں۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا۔ کہ باؤلے کتے سے لے کر دُم کٹی گلہری تک۔ چمگادڑ سے لے کر کھٹمل تک کوئی بھی ان کے لئے موزوں نہیں۔ میں نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں صاف صاف کہہ دیا۔ کہ میں کوئی نشان تلاش نہیں کر سکا۔ وہ بہت رنجیدہ ہوئے۔ اور اس سے لہجے میں کہنے لگے "عجیب بات ہے۔ آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی بھی کوئی نشان تجویز نہیں کر سکا"

"بات تو واقعی عجیب ہے۔ لیکن کیا بھی کیا جائے۔ کوئی بھی نشان آپ پر ٹھیک نہیں بیٹھتا"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے"؟ انہوں نے ایسی آواز میں کہا۔ جس پر چیخ کا گمان ہوتا تھا۔ اور ساتھ ہی اپنی اصلی اور مصنوعی آنکھ سے میری طرف گھورنے کی کوشش کی۔ یک لخت مجھے محسوس ہوا۔ گویا میں اپنی زندگی میں پہلی بار ایک جیتے جاگتے اُلّو کو اپنے سامنے بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ مَیں نے مسرت سے چلّا کر کہا "مل گیا۔ سیٹھ صاحب مل گیا"

"کیا ہے ۔ مجھے بھی تو بتائیے "

" بخدا نہایت موزوں نشان ہے "

بتائیے بھی نا "

" کاٹھ کا اُلّو "

" کاٹھ کا اُلّو ؟

" ہاں ۔ ہاں ۔ کاٹھ کا اُلّو ۔ بخدا نہایت مناسب نشان ہے "

" آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں ؟ "

" بالکل نہیں ۔ دیکھئے نا کتنا اچھوتا نشان ہے "

" اچھوتا ۔ وہ کیسے ؟ "

" اچھوتا تو ہے ہی ۔ لیکن اچھوتا ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے ۔ کوئی ووٹر اس نشان کو آسانی سے بھول نہیں سکے گا "

" مگر کچھ عجیب سا ــــــــ "

" ذرا بھر عجیب نہیں ۔ آپ شاید اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ذرا مزاحیہ ہے ۔ لیکن سیٹھ صاحب ! اس میں کوئی قباحت نہیں ۔ دوسرے یہ صرف کاٹھ کا اُلّو ہے ۔ اصلی یعنی گوشت پوست کا اُلّو نہیں اور آپ جانتے ہیں کہ دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے "

سیٹھ صاحب کی تسلی نہ ہوئی ۔ لیکن ایک گھنٹے کی بحث کے بعد میں نے انہیں یہ نشان اپنانے پر رضامند کر لیا ۔

" اچھا ۔ اب یہ بتائیے ۔ کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے لئے

کیا کچھ کرنا پڑے گا؟" سیٹھ صاحب نے نہایت سنجیدگی سے سوال کیا۔
"بہت کچھ"
"پھر بھی"
"سب سے پہلے تو ایک ہوشیار سا پراپیگنڈا سیکرٹری تلاش کیجئے۔"
"اس کے بعد"؟
"اس کے بعد ووٹروں کا اعتماد حاصل کیجئے۔"
"وہ کیسے"؟
"یہ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔"
"پھر بھی"
"بس کسی نہ کسی طرح انہیں یقین دلا دیجئے کہ آپ بہترین امیدوار ہیں"۔
"یقین تو دلایا جا سکتا ہے۔"
"تو پھر پرماتما کا نام لے کر الیکشن کے میدان میں کود پڑیئے۔"
سیٹھ صاحب نے منشی قلم دین قلم ایڈیٹر "قلمدان" کو اپنا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس سے انہیں دو فائدے ہوئے۔ ایک تو اخبار "قلمدان" کے کالموں میں ان کا باقاعدہ پراپیگنڈا ہونے لگا۔ دوسرے ایک بہترین ادیب کی خدمات صرف ان کے لئے وقف ہو گئیں۔ منشی قلم دین قلم کی ذہانت و فطانت کا اندازہ ان دو پوسٹروں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جو انہوں نے سیٹھ صاحب کے لئے تحریر کئے۔ پہلے اشتہار کا عنوان

تھا۔" اس لئے کہ"

" کاٹھ کے اُلّو کو ووٹ دیجئے۔"

اِس لئے کہ

" کاٹھ کا اُلّو کاٹھ کا اُلّو ہے۔"

اس لئے کہ

کاٹھ کا اُلّو سیاست کو بالکل نہیں سمجھتا۔

اس لئے کہ

سیاست کے علاوہ بھی وہ کسی چیز کو نہیں سمجھتا۔

اس لئے کہ

اگر آپ اسے ووٹ دینگے۔ تو ملک وہیں رہے گا۔ جہاں اب ہے۔
یعنی تنزّل کی طرف نہیں جائے گا۔

اس لئے کہ

" کاٹھ کا اُلّو بہترین اُمیدوار ہے۔ کیونکہ اس سے بڑا کاٹھ کا اُلّو کوئی نہیں۔"

دوسرے اشتہار کی عبارت یہ تھی:-

" میں وعدہ کرتا ہوں
کہ پارلیمنٹ کا ممبر بنتے ہی
ہر بالغ دنا بالغ کا راشن تگنا کردونگا۔
پانچ سال کے لئے کسی شخص پر انکم ٹیکس نہیں لگنے دونگا۔

آٹے کا بھاؤ پندرہ روپے من سے پندرہ آنے من کر دونگا۔
خالص گھی آٹھ آنے سیر ملے گا۔
گھروں میں جتنے چوہے ہیں۔ ان سب کو چن چن کر مروا دونگا۔
اپنے حلقے میں ایک بھی آوارہ کتا نہیں رہنے دونگا۔
ہر طالب علم کی فیس معاف کرا دونگا۔
ہر پھوہڑ بیوی کو خاوند کی مار پیٹ سے بچانے کا انتظام کرونگا۔
کسی بھی گندے نالے کو گندا نالہ نہیں رہنے دونگا۔"

ان اشتہاروں کا دیواروں پر چسپاں ہونا تھا کہ سارے شہر میں تہلکہ مچ گیا۔ تہلکہ مچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشتہار پر دائیں طرف سیٹھ صاحب کی تصویر تھی۔ اور بائیں طرف کاٹھ کے اُلو کی۔ لیکن ذہین سے ذہین آدمی بھی یہ تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ کہ سیٹھ صاحب اور کاٹھ کے اُلو میں کیا فرق ہے۔ یہ تصویریں مشہور آرٹسٹ مُلّو سنگھ نے کہ جو "کلو سکول آف آرٹ" سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنائی تھیں۔ ان دونوں اشتہاروں کا عوام پر بہت اثر ہوا۔ اکثر و بیشتر ووٹروں نے تسلیم کیا کہ سیٹھ صاحب نے سیاست سے اپنی لاعلمی اور ناواقفیت کا اعتراف کر کے اعلےٰ درجہ کی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ "میں وعدہ کرتا ہوں" کا جب مقابلہ دوسرے امیدواروں کے وعدوں سے کیا گیا۔ تو ان کے سب وعدے ہیچ نظر آنے لگے۔ لیکن سیٹھ صاحب نے صرف اشتہاروں پر اکتفا نہیں کی۔ عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنی فرم "گھومر اینڈ سنز" کی سٹور

جوبلی منانے کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ ان کی فرم کو قائم ہوئے مشکل سے پانچ سال ہوئے تھے۔ ایک نہایت پُرتکلّف دعوت کی گئی۔ جس میں تمام سرکردہ ووٹروں کو مدعو کیا گیا۔ دعوت کے اختتام پر سیٹھ صاحب نے یہ اعلان کیا "میں اس مبارک موقعے پر اعلان کرتا ہوں۔ کہ ہر دھرم استھان یعنی مندر مسجد۔ گوردوارے کی سفیدی اپنے خرچ اور اپنی فرم کے خالص چونے سے کراؤنگا۔ ہر دھرم استھان میں جتنا کوئلہ جلانے کے لئے درکار ہوگا۔ وہ بلاقیمت مُہیا کرونگا۔ ہر دھرم استھان کی چاردیواری کی مرمّت کے لئے جتنی اینٹوں کی ضرورت ہوگی "کچومر اینڈ سنز" ان کے لئے ایک پائی لینا بھی پاپ سمجھیں گے"۔

اس اعلان سے ان کے دھرماتما پن کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور جب واقعی انہوں نے شہر کے سب سے بڑے مندر میں بیس سیر کوئلہ بھجوا دیا تو دسمبر کی سخت سردی میں ٹھٹھرنے والے پجاری اور بھگت ان کے نام کی مالا جپنے لگے۔ پندرہ دسمبر سے پچیس دسمبر تک ہر روز سیٹھ کچومرمل کا جلوس نکالا گیا۔ ایک جیپ میں جس کی اگلی سیٹ پر ایک بڑا وزنی کاٹھ کا اُلّو رکھا گیا تھا۔ سیٹھ صاحب کو بٹھایا گیا۔ ہزاروں تماشائی کاٹھ کے اُلّو کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ شہر کے پانچ سکولوں کے طلبا کو مٹھائی کا لالچ دے کر سمجھایا گیا۔ کہ جلوس کے ساتھ ساتھ چلیں اور ہر پانچ منٹ کے بعد منشی قلم دین قلمؔ کی لکھی ہوئی نظم مل کر گائیں :۔

کاٹھ کا اُلو ۔ پیارا پیارا
کاٹھ کا اُلّو ۔ آنکھ کا تارا
کاٹھ کا اُلّو ۔ سب سے نیارا
کاٹھ کا اُلّو ۔ کبھی نہ ہارا

شہر کے مختلف حصوں میں کاٹھ کے اُلو کے حق میں جلسے کئے گئے۔ جن میں منشی قلم دین قلم کی لکھی ہوئی تقریریں پڑھی گئیں۔ عوام کو بتایا گیا۔ کہ کاٹھ کا اُلّو پارلیمینٹ کا ممبر منتخب ہونے کے بعد اُن کے لئے کیا کیا کریگا۔ قریب قریب ہر تقریر میں یہ بات دہرائی گئی۔ کہ گو کاٹھ کا اُلّو سیاست کی الف بے سے بھی ناواقف ہے۔ اسے کوئلہ۔ چُونا اور اینٹیں بیچنے کا کافی تجربہ ہے۔ گو وہ عوام کے مسائل سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن اُسے اس معاملے میں معذور سمجھا جائے۔ کیونکہ عوام کے مسائل اتنے پیچیدہ ہیں کہ کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ گو اُسے یہ معلوم نہیں کہ آیا دلی ہندوستان کی راجدھانی ہے یا ہندوستان دہلی کی۔ اسے معاف کر دیا جائیگا۔ کیونکہ اس نے جغرافیہ کبھی پڑھا ہی نہیں۔ ان تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے لوگ جو سیٹھ کچومرل کو محض کوئلے کا تاجر سمجھا کرتے تھے اسے اعلےٰ درجے کا سیاست دان سمجھنے لگے۔ اور ان میں سے بیشتر کوئلہ بھی اسی سے خریدنے لگے۔

سیٹھ کچومرل کے مقابلے میں صرف دو امیدوار تھے۔ الیکشن سے چند روز پہلے منشی قلم دین قلم نے ایک کو سیٹھ صاحب کے حق میں دستبردار

ہونے پر رضامند کر لیا - دستبرداری کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ منشی صاحب نے اُسے یہ بات ذہن نشین کرادی - کہ اگر تم جیت گئے - تو لوگ کہینگے کاٹھ کے اُلّو کے مقابلے میں جیتا ہے - اور اگر ہار گئے تو لوگ طعنہ دینگے کہ کاٹھ کے اُلّو نے ہرادیا -"

دوسرا اُمیدوار آخر دم تک ڈٹا رہا کہ نہایت سخت جان واقع ہوا تھا - اس کو سیٹھ صاحب کے مقابلے میں صرف پانچ فی صد ووٹ ملے - اور بیچارے کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی - یہ صحیح ہے کہ وہ تعلیم یافتہ تھا - "سیاست" کو سمجھتا تھا - شاید عوام کی خدمت بھی کر سکتا تھا - مگر اس کم بخت نے غلطی یہ کی - کہ اپنا نشان "ہما" منتخب کر لیا - اور آپ جانتے ہیں کہ اپنے دیس میں "کاٹھ کے اُلّو" کے مقابلے میں "ہما" کو کون پوچھتا ہے !

گرفتاری

اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک ایسی دوکان کے سامنے سے گزرتا ہوا دیکھا گیا تھا جہاں "لال کتابیں" فروخت کی جاتی ہیں۔ غالباً اسے کسی سپاہی نے جس کی ڈیوٹی اس دکان پر کڑی نگرانی رکھنا تھی۔ دیکھا تھا۔ سپاہی نے اس سنسنی خیز واقعہ کی اطلاع تحصیل ہیڈ کوارٹرز میں پہنچائی تحصیل ہیڈ کوارٹرز نے ضلع ہیڈ کوارٹرز کو بذریعہ تار مطلع کیا۔ ضلع ہیڈ کوارٹرز نے کمشنری ہیڈ کوارٹرز سے ٹیلیفون پر مشورہ کیا۔ کمشنری ہیڈ کوارٹرز نے ہدایات بھیجیں کہ اس سے پیشتر کہ ملزم "انڈر گراونڈ" ہو جائے اسے گرفتار کر لیا جائے۔

دوسرے دن جب وہ دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک انسپکٹر صاحب جن کے ساتھ نصف درجن سپاہی تھے۔ اُس کے مکان پر وارد ہوئے۔ اور انہوں نے اُسے یہ دلچسپ خبر سنائی۔ کہ وہ تلاشی دینے کے لئے تیار ہو

جائے۔

"تلاشی!" اس نے ذرا گھبرا کر کہا "لیکن مجھ سے کون سا جرم سرزد ہوا ہے؟"

"یہ ہم آپ کو کیسے بتا سکتے ہیں۔ آپ کا جرم صیغہ راز میں ہے"۔ انسپکٹر صاحب نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"ذرا اپنا کوٹ اتار دیجئے"۔ انسپکٹر صاحب نے اوپر کی جیب سے اس کا فونٹین پن نکالا۔ غور سے اس کا جائزہ لیا۔ اور اس کی نب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کی نب ضرورت سے زیادہ تیز معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ بیان کیجئے!"

"لکھنے میں اچھی رہتی ہے"۔

انسپکٹر صاحب نے کاغذ پر نب سے لکھتے ہوئے کہا "آپ پین میں لال سیاہی کیوں استعمال کرتے ہیں؟"

"مجھے لال سیاہی اچھی لگتی ہے"

"ہُم"! اور اس پر آپ کہتے ہیں کہ آپ سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا"۔ انسپکٹر نے سیاہیوں کی طرف ایک طنزیہ مسکراہٹ پھینکتے ہوئے کہا۔ کوٹ کی جیب سے ایک لاکٹ برآمد ہوا۔ اس میں ایک لڑکی کی تصویر تھی۔

"یہ کس کی تصویر ہے؟" انسپکٹر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

"ایک لڑکی کی"۔

"اُس کا نام؟"

"اُس کا نام مَیں نہیں بتا سکتا۔ صیغۂ راز میں ہے۔"

"مگر وہ ہے کون؟"

"ہے نہیں انسپکٹر صاحب! تھی! اسے یہ قصّہ ہے تب کا جب آتش جوان تھا"

"آتش؟ آتش کون ہے؟"

"ایک شاعر"

"اس کا پتہ لکھوائیے۔"

"آتش لکھنوی عدم آباد۔"

"عدم آباد یُو۔پی میں ہے نا؟"

"نہیں"

"تو پھر کون سے صُوبے میں ہے؟"

"اٹلس میں تلاش کر لیجئے گا۔"

ایک اور جیب سے سگرٹ کا ایک ٹکڑا نکلا۔ انسپکٹر صاحب نے اسے انگلیوں میں مسلتے ہوئے پُوچھا۔

"اس میں تمباکو ہی ہے نا؟"

"نہیں"

"اور کیا ہے؟"

"بارُود!"

"آپ سگریٹ میں بارُود استعمال کرتے ہیں"؟

"جی ہاں!"

"کس لئے؟"

"اپنے منہ کو بھک سے اڑانے کے لئے۔"

انسپکٹر صاحب ذرا کھسیانے ہوکر تیسری جیب کی تلاشی لینے لگے۔ اس میں سے جیب گھڑی نکال کر انہوں نے ایک سپاہی سے کہا "ذرا اس گھڑی کو کھول کر دیکھو تو۔"

"گھڑی کس لئے کھولنا چاہتے ہیں؟" اس نے ذرا ترش روئی سے کہا۔

"میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اس میں کوئی چیز تو نہیں چھپا رکھی"۔

"گھڑی میں کونسی چیز چھپائی جا سکتی ہے"؟

"ہزاروں چیزیں۔ مثلاً کاغذ کے پُرزے۔ خفیہ دستاویزیں"۔

"وائرلیس پیغام بھیجنے کا آلہ"۔ ایک سپاہی نے اپنے افسر کی مدد کرتے ہوئے کہا۔

گھڑی کھولی گئی۔ لیکن اس سے کوئی متوقع چیز برآمد نہ ہوئی۔ "اچھا اب گھر کی تلاشی دیجئے"۔ انسپکٹر صاحب نے ساتھ والے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اُس میں کیا ہے"؟ انہوں نے ایک کنستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

پوچھا۔

"مٹی کا تیل"

"مجھے تو اس سے تیزاب کی بُو آتی ہے"۔ انسپکٹر صاحب نے کنستر پر جھکتے اور اُسے سُونگھتے ہوئے فرمایا۔

"یہ آپ کی ناک کا قصُور ہے"

"یہ لوہے کے ٹکڑے یہاں کیوں پڑے ہیں"؟

"تالا توڑا تھا۔ یہ اس کے ٹکڑے ہیں"

"کِس کا تالا توڑا تھا آپ نے"؟

"اپنا"

"کیوں توڑا تھا"؟

"چابی گُم ہو گئی تھی"

"اس الماری میں کیا ہے"؟

"کتابیں"

انسپکٹر صاحب کتابوں کے ناموں پر نظر دوڑانے لگے یکا یک انہوں نے ایک کتاب نکال کر پوچھا۔

"اِس کتاب میں کیا لکھا ہے"؟

"پڑھ لیجئے"

"مَیں ذرا انگریزی کم سمجھتا ہوں"

"تو پھر رہنے دیجئے"

"نہیں آپ یہ چند سطریں جو اس کے گرد پوش پر لکھی ہیں۔ پڑھ کر مجھے سنائیے۔"

"لکھا ہے کہ جس ملک میں آزادی تحریر و تقریر پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں وہ ملک مہذب کہلانے کا حقدار نہیں۔"

"یہ الفاظ قابلِ اعتراض ہیں۔"

"یہ پنڈت نہرو کے الفاظ ہیں۔"

"پھر ٹھیک ہیں۔"

انسپکٹر صاحب نے چارپائی پر پڑی ہوئی رضائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس رضائی میں کیا ہے؟"

"دھنی ہوئی روئی۔"

"میرا مطلب ہے روئی کے علاوہ۔"

"ہوا!"

"میں کپڑے کو اُدھیڑ کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"فائدہ؟"

"شاید کوئی قابلِ اعتراض چیز نکل آئے۔"

جب رضائی کا کپڑا اُدھیڑا گیا۔ روئی کے اوپر ایک مرا ہوا کیڑا پایا گیا۔

"ان ٹرنکوں میں کیا ہے؟"

"بم اور پستول۔"

"مذاق مت کیجئے۔ ٹھیک ٹھیک بتلیئے۔"

"اینٹیں اور پتھر"

"آپ پھر مذاق کر رہے ہیں۔ صاف صاف کہیئے"۔

"آپ کے خیال میں کیا ہو سکتا ہے"؟

"کپڑے"

"پھر پوچھ کس لئے رہے ہیں"؟

"یہ میرا فرض ہے"۔

تمام ٹرنک کھلوائے گئے۔ ہر ایک کپڑے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا گیا۔ ٹین کو ٹھوکے دے کر تسلی کی گئی کہ یہ واقعی ٹین ہی ہے۔

"اس مرتبان میں کیا ہے"؟

"سانپ اور بچھو"

"اِس بکس میں کیا ہے"؟

"لڈو پیڑے اور جلیبیاں"۔

"اس ریڈیو میں کیا ہے"؟

"آہیں اور کراہیں"۔

اس طرح تلاشی کا سلسلہ تین گھنٹے جاری رہا۔ ان تمام چیزوں کی فہرست بنائی گئی۔ جو کیمیکل اگزامینر اور اسلحہ جات کے ماہرین کے پاس بھیجی جائے گی۔ فہرست میں یہ چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر تھیں۔ مٹی کے تیل کا کنستر۔ لوہے کے ٹکڑے۔ تمباکو اور فونٹین پین۔ فہرست

تیار کرنے کے بعد انسپکٹر صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"میں تمہیں زیر دفعہ ۳ پبلک سیفٹی ایکٹ گرفتار کرتا ہوں"
چھ مہینے جیل میں نظر بند رہنے کے بعد جب وہ رہا ہوا۔ تو اُسے پتہ چلا۔ کہ اس کی گرفتاری اس لئے عمل میں لائی گئی تھی۔ کہ وہ ایک ایسی دکان کے سامنے سے گذرتا ہوا دیکھا گیا تھا۔ جہاں لال کتابیں فروخت کی جاتی ہیں۔

(پہلا منظر)

(سورگ دھام میں "باپو" ایک کنج میں سنگ مرمر کی چوکی پہ بیٹھے چرخہ چلا رہے ہیں۔ اُن کا چہرہ اُداس اور سنجیدہ ہے۔ بائیں طرف سے نارد مُنی اِکتارے کو بجاتے اور "نارائن" "نارائن" کی صدا لگاتے ہوئے باپو کے قریب آتے ہیں)

نارد مُنی۔ نارائن! نارائن!! جب دیکھو چرخہ چلا رہے ہیں۔ جیسے سورگ میں کپڑے کا توڑا ہے۔ مہاتما جی! یہ سورگ پُوری ہے۔ بھارت ورش نہیں۔ کیا کیجئے گا اتنا سُوت کات کر؟

باپو۔ بھئی یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ سُوت کات کر بھگت کبیر کو دُوں گا۔ وہ میرے لئے شدھ کھدر تیار کر دینگے۔ اُسے پہنوں گا۔

نارد مُنی (قہقہہ لگاکر) شُدھ کھدر کی بھی خوب کہی! اجی جب پہننے کو ریشم ملتا ہے۔ تو کھدر تیار کرنے کا فائدہ؟ کہاں ریشم! کہاں کھدر!

باپو۔ ایشا مت کہیئے نارد جی۔ کھدر کا اپمان مت کیجئے۔ کھدر مجھے جان سے بھی پیارا ہے۔

نارد مُنی۔ مہاتما جی۔ ایک دفعہ ریشم پہنئے۔ کھدر کو بھول جائیے گا۔

باپو۔ یہ تو آپ کہتے ہیں نا۔ مگر میں تو کہتا ہوں۔ ایک بار کھدر پہنئے۔ آپ ریشم پہننا چھوڑ دینگے۔

نارد مُنی۔ نارائن! نارائن! کیسی عجیب بات کرتے ہیں آپ؟

باپو۔ بھئی، میری سب باتیں عجیب ہی ہوتی ہیں۔

نارد مُنی (ایک لمحہ کے لئے چُپ رہنے کے بعد) یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب اسی کو لیجئے۔ جب سے آپ سورگ میں آئے ہیں۔ اُداس سے رہتے ہیں۔ سورگ دھام اور اُداسی! عجیب سی بات ہے۔

باپو۔ بھئی! تم میرے من کا حال کیا جانو؟ میں ہی جانتا ہوں۔ جو دل پر گذرتی ہے۔

نارد مُنی۔ آخر وہ کونسی بات ہے۔ جس نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے؟ بھارت آزاد ہو گیا۔ جنتا خوش حال ہے۔ دھن۔ اناج۔ کپڑا کسی چیز کی کمی نہیں۔ آپ کے جانشین آپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

باپو۔ (سرد آہ بھر کر) کاش ایشا ہی ہوتا!

نارد مُنی۔ تو گویا آپ کو شک ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

باپو۔ شک ہی نہیں۔ پورا وشواس ہے۔
نارد مُنی۔ گستاخی معاف! میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔
باپو۔ آپ پہلے بھارت ورش کی دَشا (حالت) اپنی آنکھوں سے دیکھ آئیے۔ پھر بحث کیجئے گا۔
نارد مُنی۔ بہت اچھا! مَیں ابھی جاتا ہُوں۔
باپو۔ جائیے۔ لیکن اِس بات کا خیال رکھیئے گا کہ کوئی آپ کو پہچان نہ لے۔
نارد مُنی۔ اس کی فکر مت کیجئے۔ بھیس بدلنے میں مجھے کمال حاصل ہے۔

(دُوسرا منظر)

(ایک سیٹھ باپُو کی تصویر پر پھُول چڑھانے کے بعد "رام دُھن" گا رہا ہے۔ جس وقت وہ بھجن کی آخری سطر دُہراتا ہے۔ نارد مُنی ایک شرنارتھی کے بھیس میں اس کے پاس آتے ہیں)۔
نارد مُنی۔ نمستے سیٹھ جی!
سیٹھ (بے رُخی سے) نمستے
نارد مُنی۔ آپ کی گاندھی بھگتی سے من بہت پرسن ہُوا۔ آپ دھنیہ ہیں۔
سیٹھ۔ میں تو دھنیہ ہوں ہی۔ لیکن تم کون ہو؟
نارد مُنی۔ ایک غریب شرنارتھی!

سیٹھ ۔ اچھا شرنارتھی ؟ مجھے شک ہوا تھا۔ کہ انسان ہو۔ یہاں کس لئے منڈلا رہے ہو ؟

نارد منی ۔ سُنا ہے آپ کے ہاں ایک کمرہ خالی ہے ۔

سیٹھ ۔ ہاں ہاں ! ہے تو سہی ۔ تمہیں ضرورت ہے کیا ؟

نارد منی ۔ جی ہاں ۔

سیٹھ ۔ تو پھر لے لو ۔

نارد منی ۔ کرایہ کیا ہوگا ؟

سیٹھ ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ دلی میں پہلی بار آئے ہو ۔ چھوٹتے ہی کرایہ پوچھا ۔ پہلے پگڑی کا فیصلہ تو کر لو ۔

نارد منی ۔ پگڑی ؟ وہ کیا بلا ہے ؟

سیٹھ ۔ یہ تو تب پتہ چلے گا جب ادا کرو گے ۔

نارد منی ۔ اچھا تو پگڑی کا فیصلہ کر لیجئے ۔

سیٹھ ۔ دس ہزار ہوگی ۔

نارد منی ۔ دس ہزار ! میں غریب شرنارتھی ہوں ۔ دس ہزار کہاں سے لاؤں ؟

سیٹھ ۔ تو مت لاؤ ۔ کیا ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ ضرور کمرا لو ۔ اور وہ بھی دلی میں ۔ بھارت کی راجدھانی میں ۔

نارد منی ۔ کچھ رعایت کیجئے ۔

سیٹھ ۔ دس ہزار سے ایک دمڑی کم نہیں لونگا ۔

نارد مُنی (عاجزی سے) شرنارتھیوں پر رحم کیجئے۔
سیٹھ (قہقہہ لگاکر) رحم اور دلی میں! معلوم ہوتا ہے۔ اس شہر سے
پالا نہیں پڑا۔
نارد مُنی (گڑگڑا کر) پرماتما کے لئے!
سیٹھ ۔ پرماتما کا نام مت لو۔ یہ دِلّی ہے۔
نارد منی ۔ باپو کے لئے۔
سیٹھ ۔ پھر وہی بات۔ ایک دفعہ جو کہہ دیا۔ یہ دِلی ہے۔
نارد مُنی ۔ اوہ پرماتما! اب میں کیا کروں؟
سیٹھ ۔ جہنم میں جاؤ۔ گھر میں نہیں لتہ" پان کھاؤں البتہ۔ جیب میں
پھوٹی کوڑی نہیں اور چلے ہیں مکان لینے دلی میں۔ صبح صبح کس
کنگال کا مُنہ دیکھنا پڑا۔
نارد مُنی ۔ مگر سیٹھ جی ہم شر.......
سیٹھ ۔ میں اگر مگر سننے کے لئے تیار نہیں۔ خواہ مخواہ کان مت کھاؤ۔ چلتے
پھرتے نظر آؤ۔ نہیں تو ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔
(نارد مایوس ہو کر چلے جاتے ہیں)
سیٹھ ۔ (باپو کی تصویر کی طرف دیکھ کر) باپو ــــ آپ پرارتھنا کیا کرتے تھے
سب کو سُمتی دے بھگوان،
رام جانے ان شرنارتھیوں کو کب سُمتی" آئے گی۔

(تیسرا منظر)

(ایک کمرے میں انٹرویو بورڈ امیدواروں سے انٹرویو کر رہا ہے۔ نارد مُنی ایک امیدوار کے بھیس میں کمرے میں داخل ہوتے ہیں)۔

انٹرویو بورڈ کا ایک ممبر۔ تعلیم؟ قابلیت؟ سفارش؟

نارد مُنی۔ فرسٹ کلاس ایم اے ہوں۔ یونیورسٹی میں دوئم رہا تھا۔

دوسرا ممبر۔ سفارش؟

نارد مُنی۔ سفارش کوئی نہیں۔

تیسرا ممبر۔ (قہقہہ لگا کر) سفارش کوئی نہیں اور ملازمت حاصل کرنے آئے ہیں!

پہلا ممبر۔ کسی وزیر کے رشتہ دار ہو؟

نارد مُنی۔ نہیں۔

دوسرا ممبر۔ کسی سفیر سے راہ و رسم ہے؟

نارد مُنی۔ نہیں۔

تیسرا ممبر۔ کسی ایم۔ ایل اے کے داماد ہو؟

نارد مُنی۔ نہیں۔

پہلا ممبر۔ نوجوان! تم نے درخواست دے کر خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کیا۔ تم جا سکتے ہو۔ تمہیں حشر تک کوئی ملازمت نہیں ملے گی۔

چوتھا منظر

(عدالت کا کمرا - ایک ملزم کٹہرے میں کھڑا ہوا ہے - نارد مُنی
ایک تماشائی کی حیثیت سے کمرے میں داخل ہوتے ہیں) -

ملزم (جج سے) جناب میں بالکل بے قصور ہوں مجھے خواہ مخواہ گرفتار کیا
گیا ہے -

جج - (سرکاری وکیل سے) سرکاری وکیل وجہ بیان کرے کہ ملزم کو کیوں
گرفتار کیا گیا ہے ؟

سرکاری وکیل - جناب - ملزم سے واقعی فی الحال کوئی جرم سرزد نہیں ہوا -

جج - تو پھر گرفتاری کا مطلب ؟

سرکاری وکیل - اُسے شک کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے -

جج - تمہارا مطلب ؟

سرکاری وکیل - مطلب یہ کہ گو ملزم سے فی الحال کوئی جرم سرزد نہیں ہوا -
لیکن ہمیں خطرہ ہے کہ مستقبل قریب میں اُس سے کوئی نہ کوئی جرم
ضرور سرزد ہو کے رہے گا -

جج - (طنزاً) اگر یہ بات ہے - تو آپ کو ہر شخص کو ابھی سے گرفتار کر لینا
چاہیئے -

سرکاری وکیل - مجھے کوئی عذر نہیں - دراصل پبلک سیفٹی ایکٹ کا مقصد
بھی یہی ہے -

جج - میں ملزم کو بری کرتا ہوں -
سرکاری وکیل - یہ ظلم مت کیجئے گا جناب - پبلک سیفٹی ایکٹ کسی کو منہ دکھلانے کے قابل نہ رہیگا -
جج - یہ کوئی دلیل نہیں - (ملزم سے) تم بری کئے جاتے ہو -
ملزم - شکریہ ! ایک عرض کر سکتا ہوں جناب !!
جج - ہاں ہاں - کیا کہنا چاہتے ہو ؟
ملزم - از راہِ کرم انہیں تنبیہہ کر دیجئے - کہ گھر پہنچنے سے پہلے مجھے دوبارہ گرفتار نہ کرا دیں -

---

(پانچواں منظر)

وزیر خوراک بھوکوں کے مجمع میں گھرا ہوا ہے - نارد ایک بھوکے آدمی کے بھیس میں مجمع میں شامل ہو جاتے ہیں)

نارد - روٹی ! روٹی !!
وزیر خوراک صبر کرو - اور "اناج اگاؤ مہم" کے کامیاب ہونے کے بعد تمہیں روٹی ضرور ملے گی -
نارد - اس وقت کیا کھائیں ؟
وزیر خوراک - اس وقت "ہفتے میں سات دن فاقہ کرو مہم" پر عمل کرو -
نارد - ہم بھوکوں مر جائیں گے -

وزیر خوراک - تمہیں موت سے بچانے کے لئے میں زیادہ درخت اُگا رہا ہوں -

نارد - کیا درختوں پر روٹیاں اُگیں گی ؟

وزیر خوراک - روٹیاں نہیں تو پتے تو ضرور اُگیں گے - تم درختوں کے پتے کھا کر اپنا پیٹ بھر سکتے ہو -

نارد - کیا ہم حیوان ہیں ؟ ——— آپ خود پتے کیوں نہیں کھاتے ؟

وزیر خوراک - کیا میں اس لئے وزیر خوراک بنا ہوں کہ درختوں کے پتے کھاؤں -

نارد - کیا ہم نے آپ کو اس لئے وزیر خوراک بنایا ہے کہ آپ ہمیں درختوں کے پتے کھلائیں ؟

وزیر خوراک - تم بہت گستاخ ہو -

نارد - آپ بڑے ستم ظریف ہیں -

وزیر خوراک - بھاگ جاؤ تمہیں کھانے کو پتے بھی نہیں ملیں گے -

(چھٹا منظر)

(سورگ دھام میں باپو حسب معمول چرخہ چلا رہے ہیں - نارد مُنی بھارت کی یاترا سے واپس آ کر انہیں ملتے ہیں)

نارد مُنی - نارائن ! نارائن ! بھارت کی دَشا دیکھ کر تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے -

باپو - اب کہئیے نارد جی ! مَیں ٹھیک کہتا تھا یا آپ ؟

نارد مُنی ۔آپ کے جانشینوں نے تو کمال کر دیا ۔
باپُو ۔ نارد جی ! انہیں میرے جانشین کہہ کر میرا اپمان مت کیجئے ۔
نارد منی ۔ مجھے امید نہ تھی ۔کہ آپ کے بھگت اتنے نکمّے ثابت ہونگے ۔
باپُو ۔ایسی تو مجھے خود کبھی آشا نہ تھی ۔لیکن اپشوش انہوں نے تو دیش کی لُٹیا ہی ڈبو دی ۔کاش کوئی انہیں سمجھائے ۔کہ باپُو کی آتما کتنی دُکھی ہے ـــــــ کتنی دُکھی ہے ـــــــ کتنی دُکھی ہے ۔
(باپُو کی آواز بھرّا جاتی ہے ۔ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گِر رہے ہیں ۔نارد بالکل خاموش اور مبہوت ہیں)

کھجور کا درخت

"چانگ چو" جب جزیرہ "شنک" سے بھاگا۔ تو اس نے جزیرہ "چنک" میں پناہ لی۔ چنک سے بھاگ کر وہ جزیرہ "ٹنک" میں پہنچا۔ لیکن جب اسے یہاں سے بھی بھاگتے بنی تو اس نے جزیرہ "سنک" کا رخ کیا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کا ستارا گردش میں تھا یعنی اس کے پاؤں میں چکر تھا۔ اس لئے اسے وہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ اس بار وہ اس زور سے بھاگا کہ اس نے "اری کیما" کے جنگل میں جاکر دم لیا۔ یہاں پہنچ کر اسے بہت تسلی ہوئی۔ کہ اب کوئی شخص اُسے بھاگنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ اس نے ایک کھجور کے درخت کے تلے بسیرا کیا۔ چشمے کے ٹھنڈے پانی میں اپنے دھول سے اٹے ہوئے پاؤں دھوئے۔ اور خدا کا شکر بجالایا۔ کہ جس نے اس کی جان بچائی تھی۔

اپنے ملک سے وہ صرف تین چیزیں اپنے ہمراہ لایا تھا۔ اور وہ تھیں

کنفیوشس (CONFUCIUS) کی کتاب، چائے کے بہت سے ڈبے اور وائرلیس (WIRELESS) پیغام بھیجنے کا آلہ۔ اس نے ان تینوں چیزوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ آدمی کیوں خواہ مخواہ سیاست کے بکھیڑے میں پڑے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ وہ چائے پیئے۔ کنفیوشس کا مطالعہ کرے۔ اور کبھی کبھی دنیا والوں کو وائرلیس کے ذریعے اپنا پیغام بھیجے؟ جب وہ یہ سوچ رہا تھا۔ اس کی نظر ایک جنگلی پودے پر پڑی۔ جس پر بڑے بڑے سُرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔ سُرخ پھول، وہ مارے خوف کے کانپ اٹھا۔ لمحہ بھر کے لئے وہ گم سُم کھڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے ہمّت سے کام لے کر سُرخ پھولوں کو توڑ توڑ کر پاؤں تلے مسلنا شروع کیا۔ آخری پھول کو مسلتے ہوئے ایک کانٹا زور سے اس کے پاؤں میں چبھا اور اس نے رونی آواز میں کہا۔ "کم بخت یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے"۔

جنگل میں چانگ چو کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ اس بات سے اسے مسرّت ہوتی تھی۔

"کیا ہُوا" وہ اکثر اپنے آپ سے کہتا "اگر میں اپنے ملک کا راجہ نہیں رہا۔ میں اب جنگل کا راجہ ہوں۔ میں نے اپنا ملک کھو کر ایک نیا ملک پایا ہے"۔ جنگل میں چانگ چو کو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ صبح و شام وہ چائے پیتا، دوپہر کو وہ کنفیوشس کی کتاب پڑھتا اور رات کو وائرلیس کے ذریعے پیغامات بھیجتا "ہم جنگل سے بول رہے ہیں۔ آج ہمارے دارالخلافے میں کوئی حادثہ ایسا نہیں ہُوا۔ جس میں اخبار والوں کو دلچسپی ہو۔ اس

لئے گڈ نائٹ "

چانگ چو کو جنگل میں رہتے ہوئے دو برس ہو گئے۔ اس عرصہ میں اس کا وزن تین سیر بڑھ گیا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا۔ کہ اسے کسی بات کا غم نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اُسے ہر روز کھانے کو تازہ کھجوریں مل جاتی تھیں۔ ایک رات اس نے بھر پیٹ کھجوریں کھائیں۔ اور موج میں آکر دنیا بھر کے راجاؤں کے نام یہ اعلان کیا "اگر بد قسمتی سے کوئی راجہ مصیبت میں پھنس گیا ہو۔ تو وہ ہرگز نہ گھبرائے۔ سیدھا ہمارے پاس چلا آئے۔ ہم اسے ایسی تدبیر بتائیں گے کہ اس کی تمام تکالیف دور ہو جائیں گی "

یہ پیغام یوں تو تمام راجاؤں نے سنا۔ مگر اسے "چپل دیش" کے راجہ نے خاص طور سے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔ بات یہ تھی۔ کہ مہاراج چپل کو ایک عجیب بات نے بہت دنوں سے پریشان کر رکھا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ صبح سویرے وہ جنگل کو چل دینگے۔ دوسرے دن راجہ صاحب ایک پرانے رتھ میں سوار ہو کر جس کے آگے چودہ مریل گھوڑے جتے ہوئے تھے جنگل کو روانہ ہوئے۔

سفر بہت لمبا تھا اور مریل گھوڑے بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ لیکن مہاراجہ چپل نے ہمت نہ ہاری اور دن رات برابر چلتے ہوئے وہ تین ماہ کے بعد اس جنگل میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

چانگ چو اس وقت چائے پی رہا تھا۔ مہاراجہ چپل نے آداب

بجالاتے ہوئے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔ "میں چپل دیش کا راجہ ہوں۔ کچھ ماہ سے میرا سنگھاسن اس طرح ڈول رہا ہے۔ جیسے بھونچال آرہا ہو۔ میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ میری مدد فرمائیں!"

چانگ چو نے مہاراجہ چپل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چائے پیش کرتے ہوئے پوچھا۔ "اچھا تو آپ کے سنگھاسن کو یہ مرض ہوا کیسے"؟

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔ مہاراج چپل نے جواب دیا۔

"آپ نے اسے قائم رکھنے کے لئے کیا تدبیر کی ہے؟"

"ہزاروں تدابیر کیں۔ مگر کوئی کارگر نہیں ہوئی"۔

"ہوں" چانگ چو نے یک لخت سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "عجیب بات ہے"۔

"عجیب تو ہے ہی"

چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ پھر بولا "اگر آپ بُرا نہ مانیں۔ تو میں آپ سے چند اور سوالات دریافت کروں"۔

مہاراجہ چپل نے جلدی سے کہا "ہاں ہاں بڑی خوشی سے پوچھئے۔

"کیا آپ کے وزیر سمجھ بوجھ کے مالک ہیں"؟

"اے چانگ چو مہاراج!" مہاراجہ چپل نے حیرت سے کہا "یہ آپ نے کیا سوال کیا ہے"؟ کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ راج پاٹ کا کام چلانے کے لئے سمجھ بوجھ کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ ....."

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا" چانگ چو نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اب یہ بتائیے کہ آپ کے وزیر زمانے کے رُخ کے ساتھ چلتے ہیں یا اس کے مخالف؟"

"یہ اور بھی عجیب سوال ہے۔ میرے وزیروں کو اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ وہ زمانے کے رُخ کو معلوم کر سکیں"۔

"جب یہ بات ہو" چانگ چو نے پھر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تو اس کے ساتھ چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— اچھا تو یہ فرمائیے۔ کیا آپ کے ملک میں بولنے۔ لکھنے اور سوچنے کی آزادی ہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"۔

"مطلب یہ کہ اگر آپ آنکھ سے کانے ہوں اور کوئی شخص آپ سے کہے کہ آپ کانے ہیں۔ تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟"

"ہم اس گستاخ کی دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالتے ہیں"۔

"خوب! چانگ چو نے مسکرا کر کہا۔ میں بھی کبھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ کو کس چیز سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا ہے؟"

"بہت سی چیزوں سے۔ مثال کے طور پر افق کی سُرخی سے۔ بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ آگ میں تپے ہوئے لوہے سے"۔

"آپ کا سنگھاسن کس وقت ڈولتا ہے؟"

"یوں تو ہر وقت ہی ڈولتا رہتا ہے۔ لیکن خاص طور سے اس وقت جب میرے کانوں میں خوفناک آوازیں گونجنے لگتی ہیں"۔

"وہ آوازیں کون سی ہیں"؟

"میں انہیں بیان نہیں کرسکتا۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہزاروں بچے مل کر رو رہے ہوں۔ کبھی جیسے لاکھوں عورتیں آہ وزاری کر رہی ہوں۔ اور کبھی ایسے جیسے بہت خوفناک طوفان اُٹھ رہا ہو۔"

"ہوں"۔ چانگ چو نے اپنی گنجی چندیا کو کھجلاتے ہوئے کہا۔" اب آخری سوال! کیا پاتال دیش کے راجہ سے تو آپ کی دوستی نہیں؟

"ہے تو سہی"

"کیا اس کا ارادہ آپ کو مدد دینے کا تو نہیں"؟

"وعدہ تو کیا ہے لیکن ابھی تک مدد کی نہیں۔"

"کیا آپ کو امید ہے کہ آنے والے سالوں میں وہ آپ کی مدد کریگا"؟

"ہاں"

پُورا یقین ہے"؟

"سو فی صدی"

"ہا۔ ہا ——— سو فیصدی! ہاہا! سو فی صدی۔ ہاہا!" اور چانگ چو قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ اور دیر تک ہنستا رہا۔ جیسے وہ ایک دم پاگل ہو گیا ہو۔

مہاراجہ چپل اسے یُوں ہنستے دیکھ کر ششدر سے رہ گئے۔

"بات کیا ہے"؟ انہوں نے قدرے غصہ سے پُوچھا" تم اس زور سے کیوں ہنس رہے ہو"؟

"بات بہت سیدھی سی ہے"۔ چانگ چو نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔
"بات صرف اتنی ہے میرے پیارے مہاراجہ چپل! کہ ایک دن آپ کو بھی میری طرح اس کھجور کے درخت کے نیچے بسیرا کرنا پڑیگا ——
اور میرا تو مشورہ ہے کہ آپ اپنے ملک کو واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیں۔ اور یہیں میرے ساتھ آرام فرمائیں۔ کہ کنفیوشس نے کہا ہے:۔

چانگ جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

یہ سن کر مہاراجہ چپل چانگ چو کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ لیکن چانگ چو نے ہنس کر کہا۔
"کہیئے کیا ارادہ ہے؟ یہیں رہیئے گا یا آپ کے لئے کوئی دوسرا کھجور کا درخت تلاش کیا جائے؟"

نوٹ کر لیجئے

"اگر میں اب سیاسیات سے بالکل کنارا کش ہو گیا ہوں۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھ پر فالج گرا ہے۔ میں نے کوئی فیکٹری الاٹ کرا لی ہے۔ یا میری زبان گنگ ہو گئی ہے۔ جی نہیں بات یہ ہے کہ پہلے کی بہ نسبت میں بہت محتاط اور سمجھ دار ہو گیا ہوں۔ آج سے چند سال پہلے مجھے سیاست سے بڑا شغف تھا۔ کلب میں اور کلب سے باہر گھنٹوں سیاسی موضوعات پر تبصرہ کرنا میری سب سے بڑی تفریح تھی۔ ادھر کسی نے ملک یا دُنیا کے حالات کا ذکر چھیڑا۔ اور مَیں جھٹ دخل در سیاست ہو گیا۔ اجی رہنے دیجئے۔ کیا سمجھیں گے سیاست کو۔ دماغ چاہیئے بین الاقوامی مسائل کو سمجھنے کے لئے۔ آپ بس روزانہ باغ جایا کیجئے۔ جو آپ کا کام ہے"

کسی نے یُوں ہی کہہ دیا "اب تو روس اور جرمنی میں جنگ ہو کر رہیگی"۔

تو ہیں نے فوراً چلّا کر کہا۔ "آپ سے کِس بھڑوے نے کہا۔ کہ جنگ ضرور ہوگی۔ نوٹ کر لیجئے۔ جنگ نہیں ہوگی"۔ اور پھر جو میں نے بین الاقوامی صورت حال سے بحث کرنا شروع کی۔ تو سامعین دم بخود رہ گئے۔ بات بات میں تاریخی دستاویزوں اور معاہدوں کے ایسے ایسے حوالے پیش کئے کہ سننے والوں نے یہی سمجھا کوئی ملک مجھ سے مشورہ کئے بغیر جنگ کر ہی نہیں سکتا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک مخصوص حلقے میں مجھے بین الاقوامی مفکّر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اور بعض اشخاص تو مجھے اچھا خاصہ سیاسی پیغمبر سمجھنے لگے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں لوگ اکثر میرے پاس آتے اور طرح طرح کے سوال کرکے اپنے سیاسی شکوک رفع کیا کرتے۔ "کہئے اب کیا خیال ہے"۔ کسی نے جرنل رومیل کی افریقہ میں برق رفتار پیش قدمی سے گھبرا کر پوچھا اور میں نے چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے جملہ آثار پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔ نوٹ کر لیجئے۔ افریقہ میں ہٹلر کی فتح یقینی ہے میں نے بین الاقوامی حالات کا جہاں تک مطالعہ کیا ہے اُس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے"۔ "اور اس کے بعد"؟ سوال کرنے والے نے ہڑبڑا کر کہا۔

"اس کے بعد ظاہر ہے۔ کہ ہٹلر ہندوستان پر حملہ کریگا۔ اور دس بارہ گھنٹوں میں اس کا صفایا کر دے گا"۔

"جی پڑھا آپ نے؟ جرمنی نے رُوس پر حملہ کر دیا۔ اب کیا ہوگا"؟

"روس ہار جائے گا۔ ہفتے کے اندر اندر۔ نوٹ کر لیجئے"۔

"امریکہ جنگ میں کود پڑا ہے۔ اب بتائیے اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟"
"اونٹ کسی کروٹ بیٹھے پر نوٹ کر لیجئے۔ امریکہ کو شکست فاش ہوگی۔"
"روس، امریکہ اور انگلینڈ میں فوجی معاہدہ ہو گیا ہے۔ اس کا جنگ پر کیا اثر ہوگا؟"
"جنگ کی رفتار تیز ہونے کے بجائے سست ہو جائے گی۔"
ہر روز میں اس قسم کی سنسنی خیز پیش گوئیاں کرتا اور سننے والوں کے چہروں سے رنگ اڑ جاتا۔ ڈر اور گھبراہٹ کے مارے ان کے اوسان خطا ہو جاتے۔ انہیں اپنی جائدادوں کو فروخت کرنے، بیوی بچوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے اور کمپنیوں کے حصّوں کو اونے پونے داموں بیچنے کا خیال ستانے لگا۔ لیکن میری اکثر پیش گوئیاں غلط ثابت ہوتیں۔ وہ دوڑے دوڑے میرے پاس آتے اور کہتے:-
"آپ نے تو کہا تھا کہ روس ایک ہفتے کے عرصے میں ہار جائے گا۔ لیکن وہ ابھی تک بدستور لڑ رہا ہے!"
میرے پاس ان سوالوں کے معقول جواب پہلے ہی سے تیار رہتے۔
"ٹھیک ہے۔ لیکن میں نے یہ بھی تو کہا تھا۔ کہ جنگ کی رفتار تیز ہونے کے بجائے سست ہو جائے گی ــــــــــ نوٹ کر لیجئے۔ شکست انجام کار روس ہی کو ہوگی۔"
"لیکن روس تو بہت طاقتور ہے جناب!"
"قبلہ ابھی جرمنی نے بڑا حملہ شروع ہی کب کیا ہے۔ ابھی تو وہ روس

سے محض چھیڑ خانی کر رہا ہے۔"

"پھر جب روس نے پیچھے ہٹنے کی بجائے جوابی حملہ شروع کر دیا؟"

"نوٹ کر لیجئے۔ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ برلن کا رُخ کرتا ہے۔"

لیکن جب میری تمام پیش گوئیوں' دلیلوں اور اندازوں کے خلاف روس نے جنگ جیت لی۔ تو میں نے یہ کہہ کر لوگوں کا منہ بند کر دیا۔ "صاحب تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے؟"

جنگ ختم ہو جانے کے بعد۔ لوگوں کی دلچسپی بین الاقوامی مسائل میں کم ہو گئی تو مجھے بڑا دکھ ہوا۔ لیکن فوراً ہی ایک نیا سیاسی موضوع میرے ہاتھ آ گیا۔ خوش قسمتی سے قیامِ پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی اور میں اسے پکڑ کر از سر نو لوگوں پر اپنی سیاست دانی کا رعب گانٹھنے لگا۔

"کیا خیال ہے آپ کا۔ پاکستان بنے گا یا نہیں؟"

"ہرگز نہیں"

"وجہ"

"میں جو کہتا ہوں۔ یہ ایک یوٹوپیا ہے ــــــ نوٹ کر لیجئے!"

"لیکن مسلم لیگ . . . . ."

"مسلم لیگ پاکستان کا مطالبہ ضرور کرتی ہے۔ لیکن جب اسے پاکستان کی پیشکش کی جائے گی۔ تو وہ قبول کرنے سے انکار کر دے گی ــــــ اسے بھی نوٹ کر لیجئے۔"

"کیوں؟"

"یہ مت پوچھئے یہ صرف میں ہی جانتا ہوں اور بہت ممکن ہے مسلم لیگ کو بھی اس کا علم ہو۔"

لیکن کانگرس نیشلسٹ مسلمانوں اور ہندو مہاسبھائیوں کی مشترکہ کوششوں اور مخالفتوں کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا اور میں اپنے معتقدوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ چنانچہ میں نے خیریت اسی میں سمجھی۔ کہ پاکستان سے بھاگ کر ہندوستان چلا جاؤں۔

ہندوستان پہنچ کر میں نے سوچا کہ سیاسیات سے بالکل کنارہ کشی کر لوں کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ بندۂ خدا! جب تم سیاسیات کی الف ب سے بھی واقف نہیں ہو۔ اس کی شطرنج کے مہروں کو پہچان نہیں سکتے اور تمہاری سیاسی واقفیت ایک آدھ انگریزی روزنامے کے مطالعے تک کہ جو تم ہمسائے سے مانگ کر پڑھتے ہو۔ محدود ہے خواہ مخواہ سیاست میں دخل دے کر اپنی عاقبت جو کہ سیاست سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ کیوں خراب کرتے ہو"۔ چنانچہ ۱۵ اگست سن انیس سو سینتالیس سے میں تائب ہو گیا ——— نوٹ کر لیجئے۔

اب اگر کسی مجلس میں سیاسی ذکر چھیڑا جاتا ہے تو میں ایک کونے میں بیٹھا چپ چاپ سگرٹ کے کش لگاتا رہتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری رائے طلب کرتا ہے۔ تو میں جواب میں کہتا ہوں "پہلے آپ بتائیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" وہ لمبی چوڑی تقریر کرنے لگتا ہے۔ اور میں اس کی تقریر کے خاتمہ پر کہتا ہوں "جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں آپ سے سو فی صدی متفق

ہوں"۔ اگر کسی نے ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے میری رائے دریافت کرنے پر اصرار کیا۔ تو میں جان بوجھ کر بہرا بن جاتا ہوں۔

"آپ کا سٹرلنگ بیلنس کے متعلق کیا خیال ہے"؟

"کیا کہا آپ نے؟ میں ذرا اونچا سنتا ہوں"۔

"سٹرلنگ بیلنس"

"اچھا سپرنگ بیلنس۔ بڑی اچھی چیز ہے۔ کم از کم ان عام ترازوؤں سے تو بہت اچھی ہے"۔

"سٹرلنگ! سٹرلنگ"!

"معاف کیجئے اب سمجھا۔ تیمورلنگ۔ جی ہاں۔ اس کی شجاعت کا تو ہر شخص قائل تھا"۔

عموماً یہ حربہ کامیاب رہتا ہے۔ لیکن اسے اپنے واقف کاروں کی محفل میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں میں لفظ "اگر" یا "بشرطیکہ" کی پناہ لیتا ہوں۔

"سنا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ ہونے والی ہے"۔

"دیکھئے صاحب اگر ہندوستان اور پاکستان کا ارادہ جنگ کرنے کا ہے تو ضرور ہوگی۔ اور اگر نہیں ہے تو بالکل نہیں ہوگی"۔

"آثار کیا کہتے ہیں"؟

آثار قدیمہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں ممالک امن سے رہیں گے بشرطیکہ آثار جدیدہ نازک صورت اختیار نہ کر جائیں"۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہیں دو مخالف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں میں گھر جاتا ہوں۔ اور یہ نہایت نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ دودھ کے جلے کو چھاچھ پھونک پھونک کر پینا پڑتا ہے۔ مبادا منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے کہ مجھے یا میرے دوستوں کو پریشان ہونا پڑے۔

"کمیونسٹ پارٹی سراسر راستی پر ہے۔ سوشلسٹ غلط راہ پر گامزن ہیں۔"

"جی ہاں! اس بات کو تو اب تمام کمیونسٹوں نے تسلیم کر لیا ہے۔"

"سوشلسٹ پارٹی صحیح معنوں میں ملک کی راہنمائی کر سکتی ہے۔ کمیونسٹ عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ اور عوام میں معتد بہ تعداد سوشلسٹوں ہی کی ہے۔"

"آپ کو کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جانا چاہیئے۔"

"کاش میں شامل ہو سکتا۔"

"نہیں آپ کو سوشلسٹ پارٹی کا رکن ہونا چاہیئے۔"

"آپ خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

ان موقعوں پر حافظ کا مشہور سیاسی قول "با کمیونسٹ استالن استالن، با سوشلسٹ جے پرکاش جے پرکاش" خوب کام آتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ میرے دوست مضمون زیر بحث کو یوں الجھا دیتے ہیں کہ یہ پتا چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تائید کر رہے ہیں یا تردید۔ اس وقت بیچ بچاؤ کرتے ہوئے یوں کہتا ہوں "آپ دونوں درست فرماتے

ہیں۔ کیونکہ اگر آپ نوٹ کریں۔ تو یہ چیز یُوں بھی ہے۔ اور یُوں بھی ہے"۔
"جرمنی پھر اُٹھے گا۔ اور ساری دُنیا پر چھا جائیگا"۔
"رُوس نے ایسا ایٹم بم تیار کر لیا ہے جو سارے امریکا کو سُرمہ بنادیگا"۔
"ہٹلر زندہ ہے"
"سوبھاش چندر بوس بھی زندہ ہے"۔
"دونوں مِل کر پاکستان اور ہندوستان پر حملہ کرینگے"۔
کبھی کبھی ایسی چٹپٹی باتیں کوئی ہاؤس میں سنتا ہوں تو بے اختیار مُنہ سے نکل جاتا ہے "جی نہیں ——— آپ نوٹ کر لیجئے"———
لیکن فوراً ہی عاقبت کا خیال آتا ہے۔ جو بہرحال سیاست سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اور سینے پر کوفی کے پیالے رکھ کر خاموش ہو جاتا ہوں۔

رمضان یعنی ماتا دین یعنی جمنا

رمضان سری نگر سے امرت سر میں واپس آگیا ہے۔ امرت سر کے ہندوؤں اور سکھوں نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ ایک خاص جلسے میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ اور یقین دلایا گیا۔ کہ مسلمان ہونے کے باوجود وہ مشرقی پنجاب میں حفاظت سے رہ سکتا ہے۔ رمضان بہت خوش ہے اور سیٹھ دھن راج جس نے اُسے لکڑی چیرنے پر ملازم رکھ لیا ہے۔ رمضان سے بھی زیادہ خوش ہے۔ دراصل رمضان کے امرتسر سے چلے جانے کے بعد دھن راج بہت پریشان تھا۔ ہندو مزدور تین روپے روزانہ سے کم پر کام کرنے کو آمادہ نہ ہوتے۔ اور اس پر بھی سو سو نخرے کرتے۔ کام چور ایسے کہ دن بھر میں بمشکل تین من لکڑی چیرتے۔ ان کے برعکس رمضان نہایت شریف مزدور ہے۔ منوں

لکڑی چیرتا ہے۔ لیکن اُف تک نہیں کرتا۔ شام کو جب وحسن راج اس کی ہتھیلی پر بارہ آنے کی رقم رکھتا ہے۔ تو جھک کر آداب بجالاتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے "صاب تو ہمارا بڑی کھیال رکھتی" رمضان رات کو زمین پر سوتا ہے۔ لکڑی کے ذخیرہ کے پاس اور اکثر خواب میں اپنی بیوی ریشماں سے بغلگیر ہو کر کہتا ہے "یہ دیکھ میں مشرقی پنجاب سے تیرے لئے پیتل کی چوڑیاں اور ہار لے آیا ہوں" اس کی بیوی رنجیدہ خاطر ہو کر کہتی ہے "یہ میرے کس کام اب تو میں بوڑھی ہو گئی ہوں"۔ رمضان اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھاتا ہے۔ کہ ابھی وہ جوان ہے اور فرطِ محبت سے اس کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ لیکن جب رمضان کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ ریشماں کے بجائے ایک بھاری لکڑی اس کے لمبے لمبے بازوؤں کی گرفت میں ہے۔ رمضان استغفار پڑھ کر لکڑی چیرنے لگتا ہے۔ اس کا مضبوط جسم پسینے میں تر بتر ہو جاتا ہے پسینے کے بڑے بڑے قطروں میں کبھی کبھی اسے ننھے عبدل کا لبورتا ہوا چہرہ نظر آتا ہے۔ جو نہایت فریادی لہجے میں کہتا ہے "ابا سری نگر واپس آجاؤ میں بہت اداس ہوں"۔ رمضان پسینے کو ہاتھ سے جھٹک کر ایک دفعہ پھر استغفار پڑھتا ہے۔ اور لکڑی پر زور زور سے کلہاڑے برسانے لگتا ہے۔ عموماً اسے تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی رگیں اور پٹھے لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ ہلکی سی تھکن ضرور محسوس کرتا ہے اور اس احساس کو مٹانے کے لئے مہجور کا مشہور گیت گنگنانے لگتا ہے:-

صبح چھم باغ چھم مستانہ دل چھم تازہ یا ون چھم
بہارس وادھیوں چھم شوقہ سان گلزار چھاون چھم

ایسے میں دھن راج اس کے سریلے گلے کی داد دیتے ہوئے کہتا ہے۔
"خوب خوب رمضان، تم تو بڑا اچھا گانے ہو"۔ اور رمضان شرما کر جواب دیتا ہے "صاب اپنے وطن کا گانا گاتی"۔ اور اس طرح لکڑی چیرتے، پسینہ پونچھتے، گیت گنگناتے صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ رمضان چیری ہوئی لکڑیوں کو اکٹھا کر کے ایک بہت اونچا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ اور دھن راج حریصانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

"آج کتنے من لکڑی چیری؟"

"بارے من"

"شاباش! یہ رہے بارہ آنے"

"سیٹھ جی! تم ہمارا بڑا کھیال رکھتی"۔

"یہ تو میرا فرض ہے رمضان"

"سیٹھ جی تیرے پاس آکے ہم وطن بھول گئی"۔

"یہاں خوش ہونا!"

"بہت کھش سیٹھ جی! ہم یہاں مزے میں ہے"

اور رمضان واقعی بہت مزے میں ہے۔ وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔ صرف ایک دن جب سیٹھ اس پر بگڑا تھا۔ تو اسے ایک لمحے کے لئے خیال آیا۔ کہ کلہاڑا سیٹھ کی تنی ہوئی گردن پہ دے مارے۔

لیکن دوسرے لمحے وہ یہ سوچ کر اپنے غصّہ کو پی گیا۔ کہ اگر سیٹھ مر گیا تو اُسے مزدوری کون دے گا۔

رمضان یعنی ماتادین لالہ کرم چند کا نوکر ہے۔ وہ پرتاپ گڑھ کا رہنے والا ہے۔ جب وہ اپنے گھر سے چلا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ اب پچپن برس ہے۔ پچھلے چالیس سال سے وہ لالہ کرم چند کی خدمت کر رہا ہے۔ شروع میں اسے صرف روٹی کپڑے پر ملازم رکھا گیا تھا۔ اور وہ بالکل مطمئن تھا۔ پھر جب اسے پانچ روپے ہر مہینے ملنے لگے تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ ماتا دین کی تنخواہ میں ترقی صرف اس وقت کی جاتی ہے۔ جب وہ حق نمک ادا کرتا ہے۔ ایک دفعہ لالہ کرم چند کے ہاں ڈاکہ پڑا۔ تو اس نے اپنی جان پر کھیل کر مالک کی جان بچائی۔ اِس سال اس کی تنخواہ میں ایک روپے کا اضافہ کیا گیا۔ پچھلے دنوں فسادات میں ایک غنڈے نے لالہ کرم چند پر وار کیا۔ ماتا دین نے آگے بڑھ کر یہ وار اپنے بازو پر روک لیا۔ اس کا داہیاں بازو کٹ گیا۔ اور لالہ کرم چند نے نہایت فیاضی سے اس کی تنخواہ میں دو روپے کا اِضافہ کر دیا۔

لیکن ایسے موقعے بہت کم آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ چالیس برس کی جان توڑ خدمت کے باوجود ماتا دین کی تنخواہ بیس روپے سے تجاوز نہیں کر سکی۔ یہ بیس روپے بھی اُسے ہمیشہ نہیں ملتے۔ کبھی کبھی اس سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا ہے۔ اور اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ

اس سے ایک چائے کا پیالہ ٹوٹ گیا تھا۔ اور اسے پانچ روپے جرمانہ ہُوا۔ ایک اَور بار اس کی ساری تنخواہ کاٹ لی گئی۔ کیونکہ اس نے رات کے ایک بجے دروازہ دیر سے کھولا تھا۔ ماتادین کی مالکن بہت سخت مزاج ہے۔ وہ اسے ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہے۔ اس کی رائے میں وُہ نمک حرام کام چور، کمینہ اور سست اُلو جود ہے۔ وہ اسے آئے دن برخاست کر دینے کی دھمکیاں دیتی ہے۔ خاص کر جب سے وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ مالکن کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ لیکن لالہ کرم چند ہمیشہ اس سے پدرانہ شفقت سے پیش آتے ہیں۔ جب وہ سارا دن کام کرنے کے بعد تھک کر سستانے لگتا ہے تو نہایت محبت آمیز لہجے میں اس سے کہتے ہیں۔ "ماتادین ذرا ہمارے پاؤں تو داب دیجیو۔ آج ہم کچھ تھک سے گئے ہیں"۔ ماتادین ایک ہاتھ سے پاؤں دابنے لگتا ہے۔ اور لالہ کرم چند اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا شروع کرتے ہیں۔

"ماتادین! تیری بھی ساری عمر ہمارے ہاں کٹ گئی"۔

"ہاں سرکار!"

"تجھے یہاں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟"

"نہیں سرکار"

"مَیں نے تیرا ہمیشہ خیال رکھا ہے"۔

"جی ہاں سرکار"

"حالانکہ تیرا ایک بازو کٹ گیا۔ مَیں نے پھر بھی تجھے برخاست نہیں

کیا؟"

"آپ کی مہربانی ہے سرکار۔"

"ماتادین چالیس برس میں تو نے کتنا روپیہ اکٹھا کرلیا ہوگا؟"

"یہی تین چار سو سرکار۔"

"کافی ہے؟"

"جی سرکار۔ میرے ایسے آدمی کے لئے بہت ہے۔"

رمضان یعنی ماتادین یعنی جمنا کلو کی رہنے والی ہے۔ دہلی میں اسے پیارالال لایا تھا کلو میں وہ نہایت غلیظ لباس پہنے بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ پیارالال سے اس کی ملاقات ایک چشمے پر ہوئی۔ اس وقت اس کے گال تمازت آفتاب سے تمتما رہے تھے۔ آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے۔ ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں بھی خوبصورت نظر آرہی تھی۔ پیارالال کو اس پر بے حد ترس آیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ دہلی لے آیا۔ اس دن سے وہ "بازارِ حسن" میں مقیم ہے۔ اس کے آنے سے پیارالال کا کاروبار خوب چل نکلا ہے۔ رئیس زادوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ معاملہ چکاتے وقت رقم پیارالال وصول کرتا ہے۔ اور نہایت احتیاط سے اپنے بٹوے میں رکھ لیتا ہے۔ جمنا کے حصے میں صرف بخشیش آتی ہے۔ جمنا کو آدھی آدھی رات تک جاگنا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو آدھی رات کے بعد بھی سونا نصیب نہیں ہوتا۔ پیارالال سینما سے لوٹتے وقت دو چار گاہک اپنے ساتھ لے آتا ہے۔

ان کے مُنہ سے شراب کی بُو کے بھبکے نکل رہے ہوتے ہیں ۔ اور وہ واہی تباہی بکتے ہوئے سیڑھیوں پر بلا روک ٹوک چڑھ آتے ہیں۔ بعض اوقات جمنا انہیں بالکل پسند نہیں کرتی۔ لیکن پیارا لال یہ کہہ کر کہ "بشنی رئیس ہیں" اسے راضی کر لیتا ہے۔ اور اگر وہ نہ مانے۔ تو اُسے چھڑی سے پیٹنے لگتا ہے۔ گاہکوں کے چلے جانے پر جب جمنا تھکن سے چُور ہو کر پلنگ پر دراز ہوتی ہے۔ تو پیارا لال اس کے قریب لیٹ کر اس کا جسم سہلانے لگتا ہے۔ اور نہایت شیریں اور ملائم لہجے میں کہتا ہے۔

"کلُو میں تم ذلت کی زندگی بسر کر رہی تھیں؟"

"ہاں"

"تمہارے پاس پہننے کو اچھے اچھے کپڑے نہ تھے؟"

"یہ درست ہے"

"میں نے تمہیں نقلی سونے کے زیور خرید دئے"

"تم بہت اچھے ہو"

"اس کے علاوہ جتنی بخشیش ملتی ہے سب تمہاری ہے"

"میں بہت جلد امیر ہو جاؤں گی"

"جمنا! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"بالکل نہیں۔ مجھے یہاں بہت آرام ہے"

"جمنا تم کتنی اچھی ہو۔ تمہاری قسم، جب تھک جاتی ہو۔ بہت

خوبصورت لگتی ہو۔"

"واقعی ؟"

"تمہاری قسم۔"

"اچھا اب سوجاؤ میری جان! مجھے نیند آرہی ہے۔"

"اور جمنا یعنی ماتا دین یعنی رمضان سوجاتی ہے۔ اور پیارے لال یعنی کرم چند یعنی دھن راج نہایت خوش الحانی سے اقبال کا مصرعہ گنگنانے لگتا ہے ؎

انتہائے سادگی سے کھا گیا مزوور مات!

بات یہ تھی ۔ کہ رسالہ "ڈِنگ ڈانگ بمبئی" کے سالنامے کے لئے
مضمون یا پیغام بھیجنے کا سب وزیروں نے وعدہ کیا تھا لیکن بار بار
یاد دلانے کے باوجود ان میں سے کسی نے مضمون بھیجا نہ پیغام ۔ بیچارا ایڈیٹر
عجیب مصیبت میں مبتلا تھا ۔ سالنامے کی تاریخ نزدیک آرہی تھی ۔
اور اس کا دل بیٹھا جارہا تھا ۔ کہ وہ قارئین کو کیا منہ دکھائے گا ۔ اس
نے وزراء کو خطوط لکھے ۔ تار بھجوائے ۔ ٹیلیفون پر درخواست کی ۔ لیکن
اسے ہر بار یہی کہا گیا ۔ کہ پہلی فرصت میں مضمون یا پیغام بھجوا دیا جائیگا ۔
آخر یہ سوچ کر کہ خدا جانے وزرا کو پہلی فرصت نصیب بھی ہوگی یا نہیں ۔
اس نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کو راجدھانی میں بھیجا کہ خود جاکر پتہ چلائے کہ
معاملہ کیا ہے ؟ ——

اسسٹنٹ ایڈیٹر نے سب سے پہلے "یوجنا وزیر" سے ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ وہ متواتر چار دن "یوجنا وزیر" کے دفتر میں حاضر ہوتا رہا۔ لیکن ہر روز وزیر موصوف کے پرائیویٹ سیکرٹری نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ "یوجنا وزیر صاحب" کو ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ خوش قسمتی سے پانچویں دن "وزیر یوجنا" کو پانچ منٹ کی فرصت تھی۔ اور ایڈیٹر نے اسے غنیمت سمجھتے ہوئے ملاقات کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔

وزیر یوجنا نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مَیں آپ کو چار منٹ ستاون سیکنڈ دے سکتا ہوں۔ جلدی سے کہہ ڈالئے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

ایڈیٹر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ٹنگ ڈانگ کے لئے......"

"ہاں ہاں میں نے مضمون کا وعدہ کیا تھا"

"اگر آپ نے لکھ لیا ہو۔ تو عنایت......"

"آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اور کوئی کام نہیں ——" وزیر یوجنا نے کافی تلخی سے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا —— "آپ کا خیال ہے کہ مجھے اِتنی فرصت ہے۔ کہ فضول رسائل کے لئے فضول مضامین لکھتا رہوں"

"مضمون نہیں تو پیغام ہی سہی ——" ایڈیٹر نے سہمی ہوئی آواز میں کہا ——

"پیغام کے لئے بھی فرصت کہاں ہے - دن رات یوجنائیں سوچ سوچ کر دماغ پریشان ہو جاتا ہے - اس کے بعد اس میں سکت ہی کیا رہ جاتی ہے کہ کوئی اور چیز سوچ سکے ——"

"مختصر سا پیغام ہی عنایت فرمائیے"۔

"مختصر سا پیغام؟ میرے پاس کہنے کے لئے ایک لفظ تک نہیں' دراصل آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایک نئی یوجنا سوچنے کے لئے کتنی دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے - ابھی آپ کے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا - کہ برف میں سے دیسی صابن تیار کرنے کی یوجنا بنائی جائے تاکہ غریب لوگوں کو دیسی صابن سستے داموں مہیا کیا جا سکے - اس یوجنا پر پانچ کروڑ روپیہ صرف ہوگا - اڑھائی کروڑ کی تو امریکہ سے مشینری ہی آئے گی - ماہرین پر جو خرچ آئے گا وہ الگ - بیس سال کے بعد اس یوجنا کی بدولت دیسی صابن ڈیڑھ آنہ فی من کے حساب سے مل سکے گا - غور کیجئے کہ عوام کو اس یوجنا سے کتنا فائدہ ہوگا"۔

"مگر برف سے دیسی صابن ——؟"

"کیسے تیار ہو سکتا ہے ——؟ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں —— چھوڑیئے اسے سمجھنا آپ کے بس کا روگ نہیں - آپ ان ٹیکنیکل باتوں کو نہیں سمجھ سکتے - آپ کیا میرے علاوہ بہت کم لوگ انہیں سمجھ سکتے ہیں - ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک یوجنا کا اعلان کیا تھا کہ عنقریب سورج کی بنفشئی کرنوں سے شربت بنفشہ تیار کیا جائیگا - اِس اعلان پر

چند ناسمجھ ایڈیٹروں نے اخباروں میں بہت شور مچایا۔ ان کے خیال میں یہ بات ناممکنات سے تھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس یوجنا پر پینتیس کروڑ روپیہ صرف کیا جائے۔ تو پچاس سال کے اندر اسّی لاکھ گیلن شربتِ بنفشہ تیار ہو سکتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ملک کو شربتِ بنفشہ کی کتنی ضرورت ہے!"

اگر پیغام بھی نہیں تو نئی یوجناؤں کے بارے میں اپنے ارشادات ...."

"ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ آپ میرے پرائیویٹ سکریٹری سے ایک پمفلٹ جس کا نام ہے "دلچسپ یوجنائیں" لے جائیے۔ یہ باتصویر ہے اور آرٹ پیپر پر چھاپا گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں۔ تو تصویروں کے بلاک بھی آپ کو استعمال کرنے کے لئے دئے جا سکتے ہیں۔ اس پمفلٹ میں جتنی بھی یوجناؤں کا ذکر ہے سب عجیب و غریب ہیں۔ مثال کے طور پر ایک یوجنا ہے ——————

"گوبر سے کونین تیار کرنا ——————"

بہت ہی دلچسپ یوجنا ہے' یہ ایک اور یوجنا ہے ——————
نمک سے گندھک کا تیزاب بنانا —————— ایک یوجنا سورج مکھی کے پھولوں سے ربڑ تیار کرنے کے متعلق ہے۔ ایک اور عجیب و غریب یوجنا .... لیکن معاف کیجئے۔ آپ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے آپ کو تفاصیل سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ آپ پمفلٹ میں پڑھ لیجئے گا۔

— خدا حافظ —"

ایڈیٹر نے وزیر موصوف کا شکریہ ادا کیا - اُن کے پرائیویٹ سکریٹری سے پمفلٹ کی ایک کاپی لی - اور "وزیر جلوس" کے دفتر کا رُخ کیا -

" وزیر جلوس" اپنے دفتر میں نہیں تھے - وہ اپنی کوٹھی پر کمر سیدھی کرنے کی غرض سے پلنگ پر دراز تھے - ان کے پرائیویٹ سکریٹری سے پتہ چلا - کہ وہ ابھی ابھی ایک نو میل لمبے جلوس سے واپس آتے ہیں اور ان کی کمر میں شدید درد ہو رہا ہے - پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد ان کا ایک اور جلوس نکالا جائے گا - جو پندرہ میل لمبا ہوگا - اگر اُن کی کمر دوہری ہونے سے بچ گئی - تو ہاتھی پر سوار کرا کے بیس میل لمبا جلوس نکالا جائے گا -

ایڈیٹر نے حیران ہوکر کہا —

اتنا لمبا جلوس ! — اگر وزیر جلوس عوام پر نہیں تو کم از کم اپنی کمر پر ہی رحم فرمائیں - ورنہ ایک دن . . . . . ."

" ان کی کمر ٹوٹ جائے گی — آپ کا یہ مطلب ہے ؟" پرائیویٹ سکریٹری نے مسکرا کر کہا — " کوئی پروا نہیں - اُن کی کمر قوم کا بہترین سرمایہ ہے لیکن وزیر جلوس نے اپنے جسم کا ہر عضو قوم کے لئے وقف کر دیا ہے - وہ نہیں چاہتے - کہ کوئی شخص ان کے درشن سے محروم رہ جائے - آپ نے شاید اخبارات میں پڑھ لیا ہوگا کہ اگلے مہینے ملک کے مختلف شہروں میں ان کے ایک سو پینتیس جلوس نکالے جائیں گے -

چرا پونجی میں پانچ - پونا میں پندرہ - بنارس میں بیس - مدراس میں پچاس اور منٹن میں پچپن ......"

" تو اس کا مطلب یہ ہوا - کہ آئیندہ ماہ بھی وہ "ڈنگ ڈانگ" کے لئے کچھ نہیں لکھ سکیں گے!"

" آئیندہ چھوڑ آئیندہ سے آئیندہ ماہ بھی وُہ لکھنے کے قابل نہ ہونگے - ان جلوسوں کی تھکاوٹ سے ان کی کمر کی جو حالت ہو جائے گی - اُس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں - جو کمر کے دائمی درد میں مبتلا ہیں - میرا تو خیال ہے - کہ ان جلوسوں کے اختتام پر انہیں کم از کم تین ماہ کے لئے کسی نرسنگ ہوم میں آرام کرنا پڑے گا!"

" مگر وہ اتنے جلوس کس لئے نکلواتے ہیں؟" ایڈیٹر نے غیر معمولی جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا -

" ان کا خیال ہے کہ ان کا درشن کر کے بہت سے لوگوں کو ذہنی تسکین ہوتی ہے جس کا احساس اُن کی اپنی ذہنی تسکین کو تقویت پہنچاتا ہے۔"

ایڈیٹر نے پرائیویٹ سکریٹری سے رُخصت چاہی - دو ایک دن بعد وُہ "وزیر تقریر" سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا - وزیر تقریر نے شکایت کی - کہ "ڈنگ ڈانگ بھئی" ان کی تقاریر چھاپنے کی بجائے ان کا مختصر سا خلاصہ چھاپ دیتا ہے - ایڈیٹر نے عرض کی کہ وزیر تقریر کی تقاریر اتنی طویل ہوتی ہیں کہ اگر انہیں شائع کیا جائے - تو شاید ان کے سوا کوئی دُوسری چیز چھپ ہی نہ سکے - مثال کے طور پر اُس نے وزیر موصوف کی

تقریر بعنوان "اخروٹ کے فوائد" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ــــــ کہ وہ دو لاکھ پچاس ہزار الفاظ پر مشتمل تھی۔ حالانکہ اس میں صرف ایک بات بار بار دہرائی گئی تھی۔ کہ "جو قومیں اخروٹ نہیں کھاتیں وہ بہت جلد تباہ ہو جاتی ہیں"۔ وزیر تقریر نے ایڈیٹر کو مطلع کیا۔ کہ انہوں نے یہ بات دیدہ و دانستہ دہرائی تھی۔ کہ قوم کو ذہن نشین ہو جائے" ایڈیٹر نے حرفِ مطلب زبان پر لاتے ہوئے مضمون کے لئے درخواست کی۔ مضمون کا نام سنتے ہی وزیر تقریر نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا ــــــ آہ! مضمون! کاش مجھے تقریروں سے فرصت ملتی اور میں مضمون لکھ سکتا۔"

"لیکن آپ نے وعدہ کیا تھا ــــــ" ایڈیٹر نے آزمودہ حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا ــــــ

"وعدہ! وعدے تو خدا جانے کتنے کئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا انیس سو بتیس میں میں نے جمنا کے کنارے وعدہ کیا تھا۔ کہ جب ملک آزاد ہو جائے گا۔ تو تحریر اور تقریر پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جائے گا لیکن آج یہ حالت ہے۔ کہ میرے سوا . . . ."

"کسی اور کو آزادیِ تحریر و تقریر حاصل نہیں"۔

"بالکل ــــــ انیس سو چالیس میں میں نے کہا تھا کہ جب ملک آزاد ہو جائے گا۔ تو کنبہ پروری کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے خود اپنے خاندان کے کتنے نااہل افراد . . . ."

" بجا ہے۔ لیکن قسم توڑنے کے لئے ایک آدھ وعدہ تو پورا کیجئے۔ بس ایک چھوٹا سا مضمون ...... "

" کاش میرے پاس اس کے لئے وقت ہوتا۔ دراصل جب سے ملک آزاد ہوا ہے تقریر کرنے کا کچھ ایسا چسکہ پڑ گیا ہے۔ کہ موقعہ محل دیکھے بغیر تقریر کر ڈالتا ہوں۔ ابھی کل ایک اخبار کے نمائندے نے حساب لگایا کہ اگست پینتالیس سے لے کر آج تک جتنی تقریریں میں نے کی ہیں اگر انہیں کتابی صورت میں چھاپا جائے۔ تو اس سے پچاس انسائیکلو پیڈیا تیار ہو سکتی ہیں "

" میرے خیال میں نمائندے نے مبالغے سے کام نہیں لیا "

" بالکل نہیں۔ خاصکر جب اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ ان میں وہ تقریریں بھی شامل ہیں جنہیں سامعین نے سننے سے انکار کر دیا "

" آپ تقریر بازی سے توبہ کیوں نہیں کرتے ؟ "

" کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کر نہیں سکتا۔ تقریر کم بخت بھی شراب کی طرح ہے۔ یعنی ؎

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی "

" مضمون نہیں تو ' ڈونگ ڈانگ ' کے لئے پیغام ہی عطا فرمائیے "

" پیغام ؟ میرے پاس کوئی نیا پیغام نہیں۔ وہی جانا پہچانا پیغام ہے۔ جو میں سینکڑوں بار قوم کو دے چکا ہوں "

" یعنی ــــــــ ؟ "

"یعنی اپنے محبوب "وزیرِ تقریر" کی تقریریں سنیئے۔ تقریریں پڑھئے۔ تقریریں کھائیے۔ تقریریں پہنئے۔ تقاریر میں رہائش اختیار کیجئے۔ اور تقریروں میں اپنی نجات ڈھونڈئیے"!

ایڈیٹر یہ پیغام حاصل کر کے خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے باقی وزراء سے ملنے کا خیال ترک کر دیا۔ "ڈنگ ڈانگ" کے سالنامے میں اس نے یہ پیغام اس فخریہ نوٹ کے ساتھ شائع کیا ——

"کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سیاسی تدبّر کا دیوالہ پٹ چکا ہے۔ مندرجہ ذیل پیغام ان لوگوں کی نہ صرف قلعی کھول کر رکھ دے گا۔ بلکہ انہیں سوچنے پر مجبور کر دے گا کہ آیا ان کا دماغی توازن قائم بھی ہے یا نہیں ——"

اَلّم غَلّم

یعنی دو عجیب وغریب مسخرے

عجیب مسخرے ہیں یہ "اَلّم اور غَلّم" بھی! جس وقت مضمون لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں یہ دونوں میرے مکان کے سامنے گلی میں آکر لڑنے لگتے ہیں اور پھر لڑتے وقت اتنا شور مچاتے ہیں کہ خیالات کا سلسلہ ایک دم منتشر ہو جاتا ہے۔ لیجئے میں نے مشکل سے پہلا فقرہ لکھا ——

"ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ......بشرطیکہ......بشرطیکہ"

کہ وہ آگئے۔ آتے ہی انہوں نے جنگ کا اعلان کر دیا۔

اَلّم۔ "ابے چپت دکھاتا ہے؟ تیری یہ جُرأت!"

غلّم۔ "آنکھیں دکھائے گا۔ تو چپت نہیں دکھاؤنگا۔ مجھے بے غیرت سمجھا ہے کیا؟"

اَلّم۔ "تو لگا چپت!"

غلّم۔ "پہلے تو لگا!!"

اَلّم۔ "میں تیری طرح بدماس نہیں ہوں۔ سریپ (شریف) ہوں۔ سیریوں کی اولاد ہوں۔ میں پہلے کبھی چپت نہیں لگاتا۔"

غلّم۔ "جا جا بڑا آیا سریپ، آنکھیں کیوں دکھاتا ہے پھر؟"

اَلّم۔ "میں جھگڑا نہیں چاہتا۔ لیکن صلح بھی نہیں چاہتا۔"

غلّم۔ "جھگڑا میں بھی نہیں چاہتا۔ لیکن جھگڑے سے ڈرتا بھی نہیں۔"

اَلّم۔ "جھگڑا کرے گا تو دانت توڑ دونگا۔"

غلّم۔ "ابے جا بڑا آیا سورما۔ جانتا ہوں کتنا بہادر ہے تو۔"

اَلّم۔ "تو پھر ڈرتا کیوں ہے؟"

غلّم۔ "میں ڈرتا ہوں یا تو؟"

اَلّم۔ "بڑا طرم خاں بنا پھرتا ہے۔ مفت میں پٹ جائیگا۔"

غلّم۔ "چپت لگایا۔ تو انگلیاں توڑ دونگا۔"

اَلّم۔ "اچھا یہ بات ہے۔ تو آ جا پھر۔ کرلے دو ہاتھ!"

غلّم۔ "پہل تو کر پھر دیکھ کیا مجا چکھاتا ہوں۔"

اَلّم۔ "پہل تو کیوں نہیں کرتا۔"

غلّم۔ "میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

الّم۔ "میں پہل نہیں کرونگا"
غلّم۔ سربپ ہوتا تو جھگڑے کی بات ہی کیوں کرتا۔
الّم۔ "جھگڑا میں کرتا ہوں یا تو ؟"
غلّم۔ "تو"
الّم۔ "جھوٹ ! میں جھگڑا کبھی نہیں کرتا"
غلّم۔ "ارے تو تو ہے ہی بزدل۔ تو کیا کرے گا جھگڑا"
الّم۔ "کم تو بھی نہیں"
غلّم۔ "ابے چپ ہوجا۔ مجھے غصہ آگیا۔ تو مار ڈالونگا"
الّم۔ "اور مجھے غصہ آگیا تو خون پی جاؤنگا"
غلّم۔ "میں سربپ نہ ہوتا۔ تو تجھے جان سے مار ڈالتا"
الّم۔ "تو سربپ ! ارے سکل تو دیکھ آئینے میں"
غلّم۔ "بدماسوں کو سب بدماس ہی نظر آتے ہیں"
الّم۔ "ابے تو کیا جانے سات پشت سے سربپ چلا آرہا ہوں"
غلّم۔ "اور میں چودہ پشت سے سربپ ہوں۔ آیا کچھ کھیال سربپ میں ؟"
الّم۔ "ارے تو ادھ سربپ ہی ہی ہی"
غلّم۔ "ارے واہ رے میرے چاند ! ہوہوہو"

"ارے بھئی تم دونوں سربپ ہو" میں اپنے کمرے سے پکار کر کہتا ہوں۔ "اب خدا کے لئے یہ جھگڑا بند کرو۔ اور مجھے کام کرنے دو" وہ چلے جاتے ہیں۔ میں فقرہ مکمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں ——— "بشرطیکہ

بشرطیکہ ؟" عجیب بات ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ فقرہ مکمّل کیسے کیا جائے۔ طبع کی روانی رُکی بھی تو کہاں! "بشرطیکہ وہ ...... بشرطیکہ دونوں ممالک ...... بشرطیکہ یہ دونوں عظیم .... ہاں ہاں۔ بشرطیکہ ...... وہ ......" لو وہ پھر آگئے۔ اور شور مچانے لگے۔

الّم۔ "میں کہتا ہوں باغیچہ میرا ہے۔"
غلّم۔ "کون کہتا ہے تیرا ہے؟"
الّم۔ "مَیں کہتا ہوں۔"
غلّم۔ "تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ مَیں کہتا ہوں میرا ہے!"
الّم۔ "تیرے باپ کا ہے کیا؟"
غلّم۔ "میرے باپ کا نہیں تو تیرے باپ کا بھی نہیں۔"
الّم۔ "تمہارا اس پر کوئی حق نہیں!"
غلّم۔ "اور تمہارا کیا حق ہے؟"
الّم۔ "میرے کھیت کے نزدیک ہے۔"
غلّم۔ "میرے کھیت سے بھی دُور نہیں"
الّم۔ "لیکن باغیچے کا مالی مجھے چاہتا ہے۔"
غلّم۔ "وہ میرا بھی دوست ہے۔"
الّم۔ بالکل غلط۔ وہ تیرا دوست ہرگز نہیں۔"
غلّم۔ "میرا دوست نہیں تو تیرا بھی نہیں۔"
الّم۔ "دوست ہو نہ ہو باغیچہ میرا ہے۔ مَیں لے کے رہونگا۔"

علم:۔ ”ارے“ میرا میرا ”چلائے جا رہا ہے۔ کوئی ثبوت بھی ہے تیرے پاس؟“
الم:۔ ”ثبوت کیوں نہیں۔ باغیچے میں گلاب کے پودے ہیں!“
علم:۔ ”یہ کوئی ثبوت نہیں۔“
الم:۔ ”میرے کھیت میں بھی گلاب اُگتا ہے۔“
علم:۔ ”تو جس باغیچے میں گلاب اُگے وہ تیرا ہے؟“
الم:۔ ”سب باغیچے نہیں۔ صرف ایک باغیچہ!“
علم:۔ ”ارے واہ! یہ خوب دلیل ہے۔“
الم:۔ ”دلیل کیوں نہیں۔ تمہارا باغیچے پر کوئی حق نہیں۔“
علم:۔ ”حق کیوں نہیں۔ مالی سے پوچھ کر تو دیکھ۔“
الم:۔ ”تو پوچھ لے مالی سے۔“
علم:۔ ”میں کیوں پوچھوں تو پوچھ۔“
الم:۔ ”میں کیوں پوچھوں۔ اگر اس نے مجھے جواب دے دیا تو؟“
علم:۔ ”اور مجھے جواب دے دیا تو؟“
الم:۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے جواب نہیں دے گا۔“
علم:۔ ”تو پھر پوچھ کیوں نہیں لیتا؟“
الم:۔ ”ارے واہ! میں کیوں پوچھوں؟“
علم:۔ ”تو نہیں پوچھتا تو میں کیوں پوچھوں؟“
الم:۔ ”میں باغیچہ لے کر رہونگا۔ کان کھول کر سن لے۔“

غلّم: "دیکھونگا تو کیسے لیتا ہے؟"

الّم: "دیکھونگا۔ تو کیسے نہیں لینے دیتا؟"

غلّم: "دیکھ لینا وقت آنے دے۔"

الّم: "وقت تو آگیا ہے۔"

غلّم: "تو پھر کرلے دو دو ہاتھ!"

الّم: "مَیں تیار ہوں۔"

غلّم: "میں تم سے بھی زیادہ تیار ہوں۔"

الّم: "اچھا تو کر پہل۔"

غلّم: "پہل تُو کر!"

الّم: "نہیں تو کر!"

غلّم: "نہیں تو کر!"

ایک بار مَیں پھر پکار کر کہتا ہُوں "بھئی! بند کر دو یہ بحث۔ کیسا باغیچہ اور کہاں کا باغیچہ۔ اگر دونوں اس بات سے ڈرتے ہو کہ مالی صاف جواب دے دیگا۔ تو باغیچے کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اور اپنے اپنے کھیت پر شاکر رہو۔ یُوں ہی لڑ لڑ کر کیوں پریشان ہو رہے ہو؟" وہ دونوں بڑبڑاتے ہوئے ایک طرف کو چلے جاتے ہیں۔ میں سوچتا ہُوں۔ ابھی مضمون کا پہلا فقرہ مکمل نہیں ہُوا۔ یہ مضمون کب لکھا جائے گا — "بشرطیکہ دونوں ممالک فیصلہ کرلیں فیصلہ کرلیں۔ کیا فیصلہ کرلیں؟ ستیاناس ہو الّم اور غلّم کا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ہندوستان اور

پاکستان کیا فیصلہ کر لیں۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ فیصلہ کر لیں کہ ..... کہ ...... کہ ......" لیجیے وہ کم بخت پھر آ گئے۔

الّم۔ "رذیل کہیں کا۔ شرم نہیں آتی؟"

غلّم۔ "کمینہ۔ چلّو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتا۔"

الّم۔ "رذیل نہیں تو اور کیا ہے؟"

غلّم۔ "میں نے کون سی رذالت دکھائی ہے؟ ابے خواہ مخواہ بکواس کر رہا ہے۔"

الّم۔ "یہ رذالت نہیں۔ میری بہو اور بیٹی کو زبردستی اٹھا لے گیا؟"

غلّم۔ "اور تو نے جو میری بہن اور بھانجی کو زبردستی گھر ڈال لیا ہے۔ وہ شرافت ہے؟"

الّم۔ "ابے میری شرافت پر حملہ کرتا ہے؟ میرے نزدیک تو کسی کی بہن بیٹی کو بُری نظر سے دیکھنا بھی گناہ ہے۔"

غلّم۔ "اور میرے مذہب میں کسی پرائی عورت کو ہاتھ لگانا گناہ عظیم ہے"۔

الّم۔ "تو پھر میری بہو اور بیٹی کو واپس کیوں نہیں کرتا؟"

غلّم۔ "پہلے تو میری بہن اور بھانجی واپس کر۔ پھر اپنی بہو اور بیٹی کو واپس لینے کا مطالبہ کرنا۔"

الّم۔ "واہ! یہ کیا بات ہوئی؟"

غلّم۔ "بات کیوں نہ ہوئی۔ کیا میری بہن اور بھانجی کی کوئی عزّت نہیں؟"

الم ۔ ”اور کیا میری بہو اور بیٹی کی کوئی عزت نہیں ؟“
علم ۔ ”تو پھر سمجھوتہ کیوں نہیں کرتا ؟“
الم ۔ ”تو سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتا “
علم ۔ ”میں نہیں کرنا چاہتا یا تو ؟“
الم ۔ ”تو“
علم ۔ ”نہیں تو !“
الم ۔ ”نہیں تو !“

لیجئے انہوں نے پھر میں میں تو تو لگا دی ۔ اب انہیں کون سمجھائے ۔ کم بخت لڑنے سے باز ہی نہیں آتے ۔ اور پھر لڑ بھی رہے ہیں کس بات پر ! ان دونوں سے خدا سمجھے ۔ میرا تو دماغ چاٹ لیا ہے دونوں نے ۔ فقرہ مکمل کیسے ہوگا ۔ خیالات کا شیرازہ بکھر چکا ہے ۔ اچھا ایک بار پھر کوشش کی جائے ۔ ”بشرطیکہ ۔ بشرطیکہ“ ۔ اُف کچھ بھی تو نہیں سوجھتا ۔ بشرطیکہ بشرطیکہ کیا ؟ ایڈیٹر صاحب آپ ہی بتایئے بشرطیکہ پاکستان اور ہندوستان کیا کریں کہ ان کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں ؂

اپنی یادیں!

آج ۲۰ جون ۱۹۶۰ء کو مشہور طنز نگار کنہیا لال کپور اس دنیا سے گزر گئے ع

"_____ خدا بخشے بہت سی "خامیاں" تھیں مرنے والے میں۔

روحانی طور پر تو ان کی وفات اسی دن واقع ہو گئی تھی جب آج سے تیرہ برس پہلے انہیں لاہور چھوڑنا پڑا تھا۔ لیکن جسمانی طور پر وہ آج انتقال کر گئے۔ غالباً دنیا کے وہ پہلے ادیب تھے جو پیدا ایک بار ہوئے۔ لیکن مرے دو بار۔ بیمہ کمپنی والوں کے علاوہ شاید بہت کم لوگوں کو ان کی موت کا افسوس ہوا ہوگا۔ دوستوں، ڈاکٹروں اور خود اپنے اندازے کے مطابق انہوں نے بہت لمبی عمر پائی۔ اپنے خاندانی ڈاکٹر کی پیش گوئی کے مطابق انہیں آج سے کم از کم بیس برس پہلے مر جانا چاہیے تھا۔

اُردو کے اس مشہور طنز نگار کی موت دل کے صدمے سے ہوئی ۔ کل تک بالکل تندرست تھے ۔ شام کو آل انڈیا ریڈیو پر انہوں نے ایک وزیر کی تقریر سنی اور یہ تقریر سنتے ہی ان کے دل کی حرکت بند ہو گئی ۔ اس تقریر کے جن لفظوں سے انہیں صدمہ پہنچا درج ذیل ہیں :-

" اگر پروفیسر لوگ بھوکے مر رہے ہیں ۔ اگر انہیں اپنی تنخواہوں میں اضافہ ہونے کی کوئی امید نہیں ۔ اگر ان کے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ ہر ماہ امریکن پاکٹ سیریز کی دو چار سستی کتابیں خرید سکیں ۔ اگر بناسپتی گھی کھا کھا کر ان کے گلے خراب ہو گئے ہیں ۔ تو انہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ بلکہ انہیں چاہئے ۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ اناج اگائیں

پروفیسر کنہیا لال کپور بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے ۔ انہیں دیکھ کر بیک وقت ابراہیم لنکن ، قائداعظم محمد علی جناح اور آر ایل اسٹیونسن کا خیال آجاتا تھا ۔ وہ حد سے زیادہ لمبے اور دُبلے تھے ۔ جب بیٹھے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ کھڑے ہیں ۔ اور جب کھڑے ہوتے تو ایسا لگتا کہ کھڑے نہیں ہیں بلکہ گر پڑنے کی تیاری کر رہے ہیں ۔ خدا نے انہیں ایک ایسا چہرہ عطا فرمایا تھا جس میں شنکر جیسا کارٹونسٹ تو دلچسپی لے سکتا تھا لیکن چغتائی جیسا مصوّر دیکھ کر ناک بھوں چڑھا لیتا ۔

کرشن چندر کے قول کے مطابق انہوں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ۔ دُنیا میں کسی نے ان کو محبت کرنے کے قابل ہی نہیں سمجھا ۔ اس لحاظ

سے وہ صرف نام ہی کے "کنہیا" تھے۔ حیرت اس بات پر نہیں کہ انہیں عمر بھر کوئی "رادھا" نہیں ملی۔ بلکہ اس پر ہے کہ انہیں کبھی کوئی "سدامًا" بھی نہیں ملا۔

جن چیزوں کے پیچھے ایک عام آدمی بھاگتا ہے۔ مثلاً عورت، دولت قوت وغیرہ ان کا انہوں نے کبھی پیچھا نہیں کیا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے۔ کیونکہ خدا نے انہیں کافی لمبی ٹانگیں دی تھیں جہاں تک عادتوں کا تعلق ہے ان کی کوئی عادت مشکل ہی سے سراہی جا سکتی ہے آج کا کام کل کے بجائے ہمیشہ پرسوں کیا کرتے تھے۔ پرہیز کے مقابلے میں علاج کو بہتر سمجھتے تھے۔ کہتے تھے پرہیز تو ہر روز کرنا پڑتا ہے۔ لیکن علاج صرف ان دنوں میں کرایا جاتا ہے۔ جب آدمی بیمار ہو۔ دوستوں کے خطوط کا جواب نہیں دیتے تھے کہتے تھے جب تک خط اتنا دلچسپ نہ ہو۔ کہ خواہ مخواہ جواب دینے کو جی چاہے، جواب نہیں دینا چاہیئے۔ بہت کم لکھا کرتے تھے۔ زیادہ لکھنے سے اس لئے گھبراتے تھے کہ زیادہ لکھنے سے آدمی گنجا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر کی مثالیں دیتے تھے۔ ساتھ ہی کہتے تھے۔ کہ گنجا ہونے کی وجہ سے یہ پریشانی اٹھانا پڑتی ہے کہ دوست احباب چہرے کے بجائے ہمیشہ سر کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔

سست اس درجہ تھے کہ اگرچہ عمر بھر سگریٹ پیتے رہے لیکن کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ایک ایش ٹرے ہی خرید لیں۔

معمولی سے معمولی خطرے میں پڑنے سے ڈرتے تھے۔ ایک دفعہ ہوائی جہاز میں محض اس لئے سوار ہونے سے انکار کردیا۔ کہ "میں اونچائی پر سے گر کر مرنے کے بجائے چارپائی پر پڑے پڑے مرنا زیادہ پسند کرتا ہوں"۔ صحت ان کی ہمیشہ خراب رہتی تھی۔ لیکن وہ اس طرف بالکل توجہ نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے "صحت تو خراب ہے ہی۔ اگر اس کا افسوس کروں گا۔ تو دماغ بھی خراب ہو جائے گا" ان کی صحت کی فکر ان سے زیادہ ان کے دوستوں کو رہتی تھی۔

ایک بار کچھ دوست گھیر گھار کر انہیں کشمیر لے گئے۔ کشمیر کے متعلق مشہور ہے کہ اگر بھنا ہوا مرغ بھی اس سرزمین میں ہو۔ تو اس کے بال و پر دوبارہ نکل آتے ہیں۔ لیکن ان پر کشمیر کی آب و ہوا کا اثر یہ ہوا۔ کہ سر کے آدھے سے زیادہ بال جھڑ گئے۔ یعنی گنجے ہونے سے بال بال بچے۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے کبھی کشمیر کا رُخ نہیں کیا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے ایک چونکا دینے والا مضمون "غالب ترقی پسندوں کی مجلس میں" لکھا اور ——— اُردو کی ساری ادبی دُنیا میں مشہور ہو گئے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بائرن کی طرح ایک صبح اُٹھے۔ اور انہوں نے اپنے کو مشہور پایا۔ لیکن یہ ٹھیک ہے کہ انہیں مشہور ہونے کے لئے شدید انتظار نہیں کرنا پڑا۔ یہ شہرت ان کے حق میں زہر ثابت ہوئی۔ کیونکہ بہت جلد انہوں نے محنت سے لکھنا ترک کر دیا۔ ہو سکتا ہے۔ کہ جس طرح شیریڈن اپنی صرف ایک تقریر کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہیں

بھی ایک اچھے مضمون کے مصنّف ہونے کی حیثیت سے دُنیا یاد رکھے۔ یُوں تو انہوں نے بہت سے مضمون لکھے جو طنز و مزاح سے بھرپور ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انہیں مزاح نگار نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے ہر اس چیز کا جو زمین کے اُوپر اور آسمان کے نیچے ہے مذاق اڑایا۔ ادیبوں کا۔ رہنماؤں کا۔ فلمیں بنانے والوں کا۔ فلمیں دیکھنے والوں کا۔ غلامی کا۔ آزادی کا۔ لیکن انہوں نے ڈکنس یا ووڈ ہاؤس کی طرح کوئی مزاحیہ کردار اُردو ادب میں نہیں چھوڑا۔ ان کے مضامین میں کسی "مکابر" یا "جیوز" کو ڈھونڈنا فضول ہے۔ اصل میں وہ مزاح نگاری سے زیادہ طنز میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ بھارت کو مزاح کی نہیں بلکہ طنز کی ضرورت ہے۔

لکھنے کو تو انہوں نے اُردو میں چار چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں جن کے نام اتنے مشکل نہیں کہ کسی کو آسانی سے یاد نہیں رہ سکتے (یعنی سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب، اور نوکِ نشتر) لیکن ان کتابوں میں بہت کم مضمون کام کے ہیں۔ کچھ مضمون تو اتنے مختصر ہیں۔ کہ انہیں پڑھ کر مصنف پر ترس آتا ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ان کے مضمون بیحد مختصر اور بے کیف ہو گئے تھے۔ ایک بار راجندر سنگھ بیدی نے ان سے شکایت کی تھی۔ کہ آپ کی تحریروں میں اب وہ مزا نہیں جو پہلے ہوتا تھا۔ اس پر انہوں نے ہنس کر جواب دیا۔ کہ میں تو وہی ہوں لیکن پڑھنے والے اب پہلے سے زیادہ چالاک ہو گئے ہیں کہتے ہیں کہ مرنے سے ایک دن پہلے انہوں نے اپنے چاروں مجموعوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ "میں بھی

کتنا احمق ہوں کہ میں نے یہ کتابیں لکھیں۔

یہ بات بہت افسوسناک ہے کہ وہ بڑے ادیب نہیں بن سکے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح افیون کھانے کی عادت نے کالرج کی قوتِ تحریر کو تیس برس کی عمر میں تباہ کر ڈالا تھا۔ اسی طرح کالج کے نوٹس لکھنے کی عادت نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ انہوں نے پچاس برس کی عمر میں اتنے نوٹس لکھے۔ کہ ان سب کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے ایک ملٹری ٹرک کی ضرورت ہوگی۔ جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ آپ یہ ذلیل کام کیوں کرتے ہیں۔ تو رو رو کر کہا کرتے تھے۔ "سب پیٹ کی خاطر" اور عجیب بات تو یہ ہے کہ اس ذلیل کام سے بھی زیادہ روپیہ نہ کما سکے۔ کیونکہ جب وہ فوت ہوئے تو ان کا بنک میں بیلنس صفر تھا۔

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ یہ ذلیل کام نہ کرتے تو اچھے ادیب بن سکتے تھے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ پروفیسری چھوڑ کر سارا وقت ادب کی خدمت میں لگا دیتے تو امر ہو جاتے۔ خود کہتے تھے کہ اگر وہ کچھ بھی نہ لکھتے۔ تو بہت اچھے رہتے۔ بہر حال ان میں سے کوئی بات بھی ٹھیک ہو ان کو ایک ایسی کلی سے نسبت دی جا سکتی ہے جو کبھی چٹک کر پھول نہ ہو سکی۔ یا اس آگ سے جو بھڑک کر شعلہ نہ بن سکی وہ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ، ایک بجھتا ہوا شعلہ اور ایک جھلملاتا ہوا ستارا تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جگنو کی طرح ایک آدھ بار چمک کر وہ ہمیشہ کے لئے اندھیرے میں غایب ہو گئے۔ خدا کرے کہ ان کی روح کو کبھی سکون نہ ملے۔

بندہ پرور! کب تک؟

بندہ پرور! یہ سگریٹ جو میں نے ابھی آپ کو پیش کیا ہے دو سال ہوئے دو پیسے میں بکتا تھا۔ پچھلے سال تین پیسے میں اور ان دنوں ایک آنے میں مل رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آپ نے اس کی قیمت بڑھا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں آپ کی طرح ریاضی میں ماہر نہیں ہوں۔ لیکن یہ بات تو کسی معمولی ریاضی دان کی سمجھ میں بخوبی آ سکتی ہے کہ آپ نے سگریٹ کی قیمت سو فی صد بڑھا کر کرم نہیں ستم کیا ہے۔ اس پر بھی آپ فرماتے ہیں کہ میں اس ستم کو ستم نہ کہوں۔ اچھا آپ کی خاطر اسے کرم تسلیم کر لیتا ہوں۔ کہ آپ شریف آدمی ہیں۔ میرا مطلب ہے کبھی ضرور شریف ہوا کرتے تھے۔ آپ کہتے ہیں۔ اگر سگریٹ مہنگے ہو گئے ہیں۔ تو میں بیڑی کیوں نہیں پیتا۔ لیکن بندہ پرور! بیڑی بھی آجکل کونسی سستی ہے۔ بیڑی سگریٹ کے

بھاؤ بکتی ہے۔ سیگرٹ سگار کے بھاؤ۔ اور سگار اتنا مہنگا کہ آپ کے علاوہ
بہت کم لوگ پی سکتے ہیں۔ خیر سیگرٹ اور بیڑی کی بات جانے دیجئے۔ ان
کے بغیر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ راشن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔
خدانخواستہ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھتے کہ راشن کے بغیر بھی آدمی زندہ رہ سکتا
ہے۔ بندہ پرور! پچھلے ہفتے جو مجھے راشن ملا اس میں گیہوں کم اور کنکر
زیادہ تھے۔ آپ یقین فرمائیے کہ گیہوں صاف کرتے وقت کئی بار سوچنا پڑا
کہ اس میں سے کنکر چنے جائیں یا گیہوں۔ اگر ایسا راشن کھا کھا کر میری
انتڑیاں یا گردے یا دونوں بیکار ہو گئے۔ تو آپ تو یہی کہیں گے۔ کم بخت
اندھا تھا۔ مٹی اور گیہوں ملا کر کھاتا رہا۔ اور شاید میں تسلیم کرونگا۔ کہ میں
واقعی اندھا تھا۔ کیونکہ آپ شریف آدمی ہوں نہ ہوں چالاک ضرور ہیں۔
راشن کی کوالٹی کو چھوڑ دیئے۔ اس کی کوانٹٹی کو لیجئے۔ کسی ہفتے آپ مجھے
پانچ چھٹانک دیتے ہیں اور کسی ہفتے تین چھٹانک۔ کیا آپ کا یہ تو خیال
نہیں کہ ایک ہفتے مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے اور دوسرے ہفتے کم۔ آپ
کی دعا سے ابھی میرا ہاضمہ خراب نہیں ہوا۔ مجھے ہر ہفتے ایک جیسی بھوک
لگتی ہے۔ اس لئے کم از کم جب تک میرا ہاضمہ بگڑتا نہیں۔ مجھے پانچ
چھٹانک راشن دینے کی عنایت کیجئے۔ اور سنیئے بندہ پرور! جب خراب
راشن اور ناخالص گھی کھانے کے بعد بیمار پڑتا ہوں تو بخدا بیماری سے
اتنا ڈر نہیں لگتا۔ جتنا آپ کے ڈاکٹروں سے۔ سبحان اللہ! کیا خیراتی
شفاخانے کھول رکھے ہیں آپ نے۔ گھنٹوں قطار میں کھڑا رہتا ہوں۔

لیکن باری نہیں آتی - ایک انار وصد بیمار والا معاملہ ہوتا ہے - اور پھر ہسپتال! اگر بستر ملتا ہے تو دوا نہیں ملتی - دوا ملتی ہے تو بستر نہیں ملتا- ڈاکٹر بات سُن لیتا ہے تو نرس پروا نہیں کرتی - نرس مہربان ہوتی ہے تو کمپونڈر روٹھ جاتا ہے - گستاخی معاف! کہیں آپ نے یہ شفاخانے آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کو کم کرنے کے لئے تو نہیں کھولے- اگر یہ بات ہے تو پھر تو وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں -

بندہ پرور! پچھلے چند سالوں سے آپ نے اتنے "جرمانے" لگا دیئے ہیں کہ بسا اوقات سوچتا ہوں کہ آپ کا کام صرف جرمانے لگانا اور میرا کام جرمانے ادا کرنا ہے- معلوم ہوتا ہے- کہ میں کماتا اسی لئے ہوں کہ آپ کے لگائے ہوئے جرمانے ادا کرسکوں - اگر گھڑی خریدتا ہوں تو گھڑی خریدنے کا جرمانہ ادا کرتا ہوں - اگر قلم لیتا ہوں تو قلم خریدنے کا جرمانہ دیتا ہوں- گھڑی یا قلم خریدنے کے بعد جو تھوڑی بہت "کمر" بچ جاتی ہے - اُسے آپ کا جرمانہ توڑ دیتا ہے - خون پسینہ بہا کر روپیہ کماتا ہوں- لیکن روپیہ کمانے کا بھی جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے - چاہیئے تو یہ تھا کہ آپ میری ہمّت اور مشقت کو سراہتے اور مجھے ایک آدھ تمغہ عطا فرماتے- لیکن آپ تو اُلٹا جرمانہ طلب کرتے ہیں- ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ آپ یہ جرمانے اپنے قول کے مطابق میری بہبودی کے لئے وصول کرتے ہیں - یہ بات سمجھ میں نہیں آئی - کہ اس میں میری بہبودی کیا ہے - یہ تو ایسا ہی ہے - کہ آپ میری کھال اتارتے یا خون نچوڑتے چلے جائیں اور ساتھ کہیں

کہ آپ میری بہبودی کے لئے کر رہے ہیں۔ میں آپ جیسا ذہین نہ سہی۔ لیکن اتنا کند ذہن بھی نہیں کہ آپ میری کھال اتاریں۔ مجھے تکلیف محسوس ہو۔ اور میں اسے اپنی بہبودی سمجھوں۔

اچھا یہ بھی جانے دیجئے۔ یہ جو آجکل آپ مجھے فلمیں دکھا رہے ہیں ان کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے دکھانے سے پہلے جب آپ خود دیکھتے ہیں۔ تو آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں اور کانوں میں روئی ٹھونس لیتے ہیں۔ اسی لئے تو آپ کو عریاں سے عریاں منظر نظر نہیں آتا۔ اور بیہودہ سے بیہودہ گانا سنائی نہیں دیتا۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ آپ ایسی فلمیں مجھے اور میرے بچوں کو کبھی نہ دکھاتے پھر ستم یہ کہ کسی بھی اچھے ملک کی بنی ہوئی فلمیں آپ مجھے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کہیں آپ کی رائے میں فلموں سے مراد محض "ننگی پنڈلیاں" یا "نیم عریاں سینے" تو نہیں۔ بندہ پرور کچھ سمجھ دار لوگ تو فلموں سے بڑے بڑے کام نکالتے ہیں۔ پھر آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ نیم عریاں اعضاء کی نمائش ہی فلموں کا سب سے بڑا افادی پہلو ہے۔ آپ کا اپنا مذاق لاکھ پست سہی۔ لیکن آپ میرا مذاق بگاڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ آپ شاید کہیں گے کہ تمہارا مذاق سنوارنا میرا کام نہیں۔ یہ ادباء اور معلمین کا ہے۔ لیکن آپ نے ادباء اور معلمین کے لئے کیا کیا ہے۔ یہی نا کہ بہترین ادباء اور معلمین کو جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ اور باقی کی تصانیف کو نذرِ آتش کرا دیا۔

یہ بھی فضول بات ہے ؟ اچھا اسے بھی رہنے دیجئے۔ خدارا یہ بتائیے کہ آپ مجھ سے خواہ مخواہ کیوں ڈرتے رہتے ہیں۔ میں تو ایک بے ضرر انسان ہوں۔ میرے پاس نہ پستول ہے نہ بم۔ پستول میں نے دوسروں کے پاس دیکھا ضرور ہے۔ لیکن یقین فرمائیے۔ چلایا کبھی نہیں اور بم! بم کی شکل سے ہی ناواقف ہوں۔ لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ میں ہر وقت ہاتھ میں پستول اور بغل میں بم لئے پھرتا ہوں۔ یہ جو آپ نے نصف درجن خادم صرف میری نگرانی کے لئے تعینات کر رکھے ہیں۔ میرے خیال میں بڑے مضحکہ خیز ہیں۔ انہیں اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ سائے کی طرح میرے پیچھے لگے رہیں۔ سایہ تو صرف روشنی میں تعاقب کرتا ہے۔ یہ تاریکی میں بھی پیچھا کرنے سے باز نہیں آتے۔ اگر میں کسی ہوٹل میں چائے پینے جاتا ہوں تو یہ بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میں چائے کا پیالہ اٹھاتا ہوں۔ یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ میں پیالہ دائیں ہاتھ سے اٹھاتا ہوں یا بائیں ہاتھ سے۔ اگر میں فلم دیکھنے جاتا ہوں۔ تو وہ یہ دیکھنے جاتے ہیں۔ کہ میں کونسی فلم دیکھنے گیا تھا۔ اور پھر یہ میرے متعلق عجیب و غریب انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ "آج شام کے پانچ بجے یہ خطرناک شخص فلاں سڑک پر کھڑا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ سڑک کو بارود سے اڑانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔" "کل دن کے ایک بجے یہ شخص فلاں بینک میں داخل ہوا۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ بینک کو لوٹنا چاہتا تھا۔" "آج صبح کے سات بجے یہ شخص سیکریٹریٹ کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ صاف ظاہر

ہے کہ حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتا تھا۔"

بندہ پرور! جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا۔ میرے پاس پستول ہے نہ بم۔ پیشۂ آبا سو پشت سے نہیں ہزار پشت سے سپہ گری نہیں رہا۔ ایک معمولی سا سیکنڈ ہینڈ قلم ضرور ہے۔ اس کی نب بھی اتنی گھس چکی ہے کہ تین بار روشنائی میں ڈبوؤں تو ایک لفظ لکھتی ہے۔ پھر خواہ مخواہ میرا تعاقب کیوں کیا جا رہا ہے۔ بندہ پرور آپ کہینگے کہ میری سب شکائتیں فضول ہیں یا یہ کہ وہ جائز ہیں لیکن آپ انہیں رفع کرنے کی کوشش کرینگے۔ پانچ سال ہوئے آپ نے یہی کہا تھا آج بھی یہی کہتے ہیں۔ مجھے نہ اس وقت یقین آیا تھا نہ اب آ رہا ہے۔ لیکن ان پانچ سالوں کے بعد بھی اگرچہ آپ وہی ہیں جو پہلے تھے۔ کم از کم میں یقیناً وہ نہیں ہوں جو کبھی تھا۔ آپ کے پاس لاکھ خوبصورت الفاظ سہی لیکن اب آپ مجھے ان خوبصورت جھنجھنوں سے بہلا نہیں سکتے۔ میں جانتا ہوں آپ بڑے شعبدہ باز ہیں لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کرینگے کہ جب کسی شعبدے کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹ جاتا ہے تو وہ شعبدہ نہیں رہتا۔ ایک بہت بڑا مذاق بن جاتا ہے۔ آپ مجھے ہزار ایسے سبز باغ دکھائیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ وہ باغ ہیں۔ جہاں بہار کا بھولے سے بھی گذر نہیں ہوتا۔ یہ نہ صرف میں نے جان لیا ہے بلکہ میرے جیسے لاکھوں انسانوں پر یہ راز کھل چکا ہے کہ آپ اور داغ دہلوی کے "بت حیلہ جو" میں صرف یہ فرق ہے کہ وہ خوبصورت تھا اور آپ خوبصورت نہ ہونے کے باوجود "حیلہ جو" ہیں۔ ان حالات میں آپ کا یہ کہنا کہ آپ ایک بار پھر مجھے فریب دینے کی کوشش کریں گے۔ کہاں تک کارآمد ہو سکتا ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ عوام کو فریب دیا جا سکتا ہے اور دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے بندہ پرور کہ بندہ پرور آکب تلک؟

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لاہور میں دھوبیوں کی بستی میں
رہتا تھا۔ دھوبیوں کی بستی تو میں نے یونہی کہا۔ دراصل یہ دھوبیوں، نائیوں
اور کمہاروں کی مشترکہ بستی تھی۔ اس چھوٹی سی بستی میں میری حیثیت صدر
ٹرومین کی سی تھی۔ کیونکہ اپنے سب ہمسایوں سے میں ممتاز سمجھا جاتا تھا۔
ایک دن میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے۔
شکل و صورت سے شریف تو نہیں لیکن کافی مظلوم معلوم ہوتے تھے۔
انہوں نے اپنا تعارف کرائے بغیر مجھ سے پوچھا "کیوں صاحب! کچھ آپ
کو معلوم ہے آپ کے محلے میں دھوبیوں کی دو جماعتوں میں لڑائی ہوگئی ہے۔
جس میں تین دھوبی سخت زخمی ہوئے ہیں" میں نے جواب دیا۔ "مجھے
اس لڑائی کا کوئی علم نہیں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے دھوبیوں میں

کوئی لڑائی نہیں ہوئی"۔

"تو پھر شاید نائیوں میں لڑائی ہوئی ہوگی"۔

"مجھے اس بات کا بھی علم نہیں"۔

"شاید کمہاروں میں . . . . . ."

"مجھے اس کا بھی کوئی پتہ نہیں"۔

وہ مایوس ہو کر واپس جانے لگا۔ میں نے کہا۔"لڑائی جھگڑوں میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ ٹھہریئے میں شریمتی جی سے پوچھتا ہوں"۔ شریمتی جی نے بتایا کہ ایک دھوبن اپنی ہمسائی کمہارن سے صبح لڑ رہی تھی۔ شاید دھوبن کے لڑکے نے کمہارن کی لڑکی کو پیٹا تھا۔ یا شاید کمہارن کی لڑکی نے دھوبن کے لڑکے کو۔

میں نے انہیں صورت حالات سے آگاہ کیا۔ وہ بہت اداس لہجے میں کہنے لگے:

"کھودا پہاڑ نکلا چوہا"۔

میں نے دریافت کیا"۔ آپ اس لڑائی میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتے ہیں"؟

کہنے لگے"۔ میں ایک ایسے اخبار کا نامہ نگار ہوں جو سنسنی خیز خبریں چھاپتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اخبار کے لئے ایک اچھی خبر کا مواد ہاتھ لگے گا۔ مگر یہاں تو حالت ہی دوسری ہے"۔

رخصت ہونے سے پہلے کہنے لگے"۔ اگر مستقبل قریب میں آپ

کہ محلے میں کوئی سنسنی خیز واقعہ ظہور میں آجائے۔ تو مجھے ضرور اطلاع دیجئے۔ میں آپ کو گاہے بگاہے ملتا رہونگا۔"

اس ملاقات کے بعد وہ مجھے اکثر ملے۔ اور ہر بار انہوں نے مطالبہ کیا "کہئے کوئی تازہ واقعہ ہوا؟"

میں نے ہر بار انکار میں سر ہلا دیا۔ ایک دن غصّے میں آکر کہنے لگے "کیسا محلہ ہے آپ کا۔ یہاں کوئی واقعہ نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کوشش ہی نہیں کرتے۔"

چند دنوں کے بعد ہمارے محلّے میں دو سانڈ لڑ پڑے۔ میں نے انہیں اطلاع دے دی۔ وہ بھاگم بھاگ ہمارے محلّے میں آئے۔ مگر ان کے آنے سے پہلے سانڈ لڑ جھگڑ کر کہیں جا چکے تھے۔

واقعہ کی تمام تفصیل نوٹ کرنے کے بعد کہنے لگے "سانڈ کہاں ہیں؟" میں نے کہا "معلوم نہیں"۔ فرمانے لگے "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ اتنا بھی نہیں ہوسکا کہ میرے آنے تک روک ہی لیتے۔" میں نے حیران ہوکر پوچھا "سانڈ تو شاید آپ کی کچھ مدد نہ کرسکتے۔" انہوں نے چیں بہ جبیں ہوکر کہا "میں سانڈوں کا فوٹو لینا چاہتا تھا۔ فوٹو کے بغیر خبر کچھ پھیکی پھیکی لگے گی۔"

کچھ اور دنوں کے بعد برسات شروع ہوگئی۔ ایک دن وہ پھر میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے۔

"آج میں ضرور ایک اچھی خبر کے لئے مواد لے کر جاؤنگا۔ کہئے آپ

کے محلے میں کتنے مکان گرے۔ کتنے آدمی زخمی ہوئے۔ کتنے مرے"؟
میں نے جواب دیا "آپ کو سن کر مایوسی ہو گی کہ فی الحال ایک بھی نہیں"۔
"لیکن کچھ مکانوں کے گرنے کی توقع کی جا سکتی ہے"؟
"ابھی سے کچھ نہیں کہا جا سکتا"۔
"عجیب بات ہے۔ سب کچے مکان ہیں اور کم بخت ایک بھی گرنے کو تیار نہیں"۔

ایک بار مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے ملے۔ فرمانے لگے۔ آج مزا آ گیا۔ ایک موٹر اور لاری میں ایسی زبردست ٹکر ہوئی۔ کہ تمام مسافر جان بحق ہو گئے۔ حتٰی کہ ڈرائیور بھی"۔ ہنسی کو بمشکل ضبط کرنے کے بعد کہنے لگے۔ "آپ نے دیکھا ہو گا۔ کہ جب بھی دو گاڑیوں کی ٹکر ہوتی ہے یہ کمبخت ڈرائیور عموماً بچ جاتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ پہلا سانحہ ہے۔ جس میں دونوں میں سے ایک ڈرائیور بھی جانبر نہ ہو سکا۔

میں نے سانحے پر رسمی افسوس ظاہر کیا۔ بولے۔
"خوشی کی بات تو یہ ہے کہ اتنے دنوں کے بعد ایک دلچسپ سانحہ ہوا۔ ہر روز مال روڈ سے مایوس ہو کر گھر جانا پڑتا تھا۔ آج ایک خبر ہاتھ لگی۔ ورنہ آپ ...." جب وہ بات کر رہے تھے۔ فائر بریگیڈ ٹن ٹن کرتا مال روڈ سے گذرا۔ بات چیت کئے بغیر وہ سائیکل پر سوار ہو کر فائر بریگیڈ کے پیچھے پیچھے ہوا ہو گئے۔ شام کو ملے۔ اور

میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہنے لگے۔ "بھئی! کمال ہوگیا۔ پرماتما جب دینے پر آتا ہے۔ تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ایک ہی دن میں دو دو مزیدار خبریں۔ ایسی آگ لگی کہ ایک چھوڑ دو مکانات جل کر راکھ ہو گئے۔ تین لاکھ کا نقصان ہوا۔ بخدا مزا آگیا۔"

"آگ کہاں لگی تھی؟"

"گوالمنڈی میں۔ گندا انجن کے قریب"۔

"دونوں مکان جل گئے؟"

"بالکل! میں کہتا ہوں ایک اینٹ تک نہیں بچی۔"

"کافی نقصان ہوا ہوگا۔"

"ہاں نقصان تو ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے اگر آگ لگے تو لیکن ...."

"لیکن؟"

"کم از کم دو کالم کی خبر لگے گی۔ دو کالم کا مطلب ہے ....."

"مطلب ہے؟"

"بیس روپے"

ایک لمحہ کے سکوت کے بعد کہنے لگے۔ "ایسی خبریں قسمت سے ہی ہاتھ آتی ہیں۔ ذرا خیال کیجئے۔ اگر ہر روز ایک آدھ ایسی خبر مل جائے۔ تو کتنے کالم بن سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے بیس ضرب تیس چھ سو روپیہ ماہوار۔"

اس ملاقات کے بعد وہ مجھے پندرہ بیس روز نہ ملے۔ ایک دن لارنس گارڈن میں سیر کرتے ہوئے اتفاقاً اُن سے تصادم ہو گیا۔ میں نے پُوچھا "کہئے کیا حال ہے؟" جواب میں کہنے لگے۔ "چند دنوں سے حال بہت پتلا ہے۔ کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی۔ کچھ مدد کیجئے"۔ میں نے معذوری ظاہر کی۔ فرمانے لگے۔ "اچھا کوئی بات سنائیے شاید کوئی مواد مل جائے"۔

میں نے برسبیل تذکرہ کہا۔ "آج کل محلّے میں آوارہ کتوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میونسپلٹی اس معاملے کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دے رہی"۔

"خوب! اور کوئی بات؟"

"کالج کے منتظمین روز بروز سخت ہو رہے ہیں۔ کام زیادہ لیتے ہیں۔ تنخواہ بڑھاتے نہیں۔ یہ قومی کالج کاہے کو ہیں۔ بوچڑ خانے ہیں"۔

"بالکل بجا ہے۔ اور کہیئے"۔

"لارنس گارڈن میں ان دنوں نئے شادی شدہ جوڑے بڑی آزادی سے گھومتے ہیں شاید اس لئے کہ موسم بہار ہے"۔

"درست ہے"

"شہر میں چوریوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چوروں کے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ کل ایک بے چاری بڑھیا کو دن

و ناڑے لُوٹ لیا "۔

" آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں "۔

اس قسم کی اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تین چار دنوں کے بعد مجھے پرنسپل صاحب کا بُلاوا آیا۔ جب میں ان کے دفتر میں داخل ہوا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ بہت برہم پا رہے ہیں۔ انہوں نے "سنسنی خیز بمبئی" کا تازہ پرچہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا "اس کے متعلق اپنی پوزیشن کی وضاحت کیجئے۔" ایک خبر کا عنوان جلی حروف میں میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ لکھا تھا۔

" قومی کالج دکانیں نہیں بلڈ بینک ہیں۔ جہاں غریب پروفیسروں کا خون نچوڑا جاتا ہے "۔

" انٹرنیشنل کالج کے پروفیسر کا سنسنی خیز انکشاف "

" تنخواہ پچاس روپے۔ کام پندرہ گھنٹے روزانہ "

" میں نے جلدی جلدی خبر پڑھی۔ نامہ نگار صاحب نے میرے نام اور پورے پتہ کے حوالے سے نہایت سنسنی خیز انکشافات کئے تھے۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پرنسپل صاحب نے گرج کر کہا۔ " یہ ایسی حرکت ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مہینے کے بعد اپنا انتظام کر لیجئے۔ کہ نوٹس کی میعاد ایک مہینہ ہے "۔

دُوسرے دن مجھے میونسپل کمیٹی کے صدر کا ایک خط ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ آپ نے اخبار "سنسنی خیز" کے نامہ نگار کو بیان دیتے ہوئے صاف

دروغ بیانی سے کام لیا ہے۔ شہر میں جہاں تک میونسپلٹی کو علم ہے ایک بھی باولا کتا نہیں۔ اِس لئے یہ کہنا کہ دھوبی محلہ میں آدمیوں کی بہ نسبت باولے کتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اور اس وقت تک کم از کم ۵۰ آدمیوں کو باولے کتوں نے کاٹ کھایا ہے۔ ایک ایسا جھوٹ ہے جس کی توقع ایک پڑھے لکھے آدمی سے نہیں کی جاسکتی۔ چہ جائیکہ وہ ایک ذمہ دار پروفیسر بھی ہے۔

تین چار دنوں کے بعد نامہ نگار صاحب پھر ملے۔ کہنے لگے "آپ نے "سنسنی خیز کہانی" کے کالموں میں پڑھ ہی لیا ہوگا کہ میونسپلٹی اور کالج کے منتظمین کی میں نے کیسی خبر لی ہے۔ کہئے آج کچھ نیا مصالحہ بہم پہنچائیں گے یا نہیں؟"

میں نے آبدیدہ ہوکر کہا "نیا مصالحہ تو بعد میں دیکھا جائیگا۔ پہلے میرے لئے ملازمت کا بندوبست کیجئے"

چوپٹ راجا

چوپٹ راجا کی بھی عجیب شکل تھی ۔ خرگوش کی طرح لمبے لمبے کان ۔ چوہے کی طرح چھوٹی چھوٹی آنکھیں ۔ حبشیوں کی طرح موٹے موٹے ہونٹ اور دماغ ۔ خیر دماغ تو اس کے پاس تھا ہی نہیں ۔ وہ ہمیشہ عجیب و غریب حرکتیں کیا کرتا تھا ۔ کبھی تخت پر بیٹھنے کے بجائے اس پر سر کے بل کھڑا ہو جاتا ۔ کبھی بھرے دربار میں امراؤ وزرا کے پتھر مارنے لگتا ۔ اور کبھی گانا سنتے وقت سارنگی اٹھا کر سازندوں کے سر پر دے مارتا ۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی رعایا کو اس سے بے پناہ عقیدت تھی ۔ اس کی راجدھانی "اندھیر نگری" میں ہر چیز ـــــــــ جواہرات سے لے کر بادام تک ٹکے سیر بکتی تھی ۔ خوراک ۔ کپڑے ۔ شراب غرضیکہ کسی شے کی کمی نہیں تھی ۔ وہ ہر رات بھیس بدل کر اپنی راجدھانی کی گشت کیا کرتا ۔ اور چونکہ اندھیر نگری کی سڑکوں پر آتا نا

اندھیرا ہوتا تھا کہ سرچ لائٹ کی مدد سے بھی بہت کم چیزیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ اس لئے وہ کچھ دیکھے سنے بغیر بڑے اطمینان سے محل کو لوٹ آتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ اس کی رعیت خوشحال ہے۔

ایک دن نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے رات کے بجائے دن کو اپنی راجدھانی کا گشت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ جب قلعے کے گھڑیال نے دس بجائے۔ چوپٹ راجا ایک مسخرے کے بھیس میں محل سے روانہ ہوا۔ سڑک پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اگر دنیا کے تمام ممالک "ٹکے سیر" والا اصول اپنالیں تو مہنگائی کا فوراً خاتمہ ہو جائے۔ اور یہ سوچتے سوچتے وہ گنگنانے لگا۔

ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا

جب وہ اس مصرعہ کو پچاس بار گنگنا چکا۔ تو وہ کچھ تھک سا گیا۔ اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ معاً اس کی آنکھ لگ گئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کی راجدھانی میں تمام عمارتیں سونے اور چاندی کی بنی ہوئی ہیں۔ حورشمائل بیویاں انگور کی بہترین شراب کے جام لنڈھا رہی ہیں۔ اور بدمست خاوند گاؤ تکیوں کے سہارے لیٹے ہوئے "رباعیات عمر خیام" پڑھ رہے ہیں۔ وہ یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اتنے میں ایک رقاصہ ساغر بکف اس کی جانب بڑھی ایک نہایت دلکش ادا کے ساتھ اس نے جام اس کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ شراب پینے لگا۔ اور رقاصہ نے ناچنا شروع کیا۔ یک لخت

رقاصہ نے ناچتے ناچتے ایک دلدوز چیخ بلند کی۔ چوپٹ راجا کے ہاتھوں سے پیالہ گر پڑا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ رقاصہ غائب ہو چکی تھی۔ اور اس کی بجائے ایک نوجوان درخت کے تنے سے لپٹا ہوا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ چوپٹ راجا اس کے پاس گیا اور یوں گویا ہوا۔ "اے نوجوان! تو کیوں رو رہا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا۔ کہ اندھیر نگری میں ہر شخص خوشحال ہے۔ کیونکہ یہاں ہر چیز ٹکے سیر بکتی ہے۔"

نوجوان نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "کاش! ایسا ہوتا۔"

چوپٹ راجہ نے جھلّا کر کہا۔ "تو گویا تجھے اس میں کلام ہے کہ یہاں ہر چیز ٹکے سیر نہیں بکتی۔"

نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ چوپٹ راجا کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ اس نے تلوار میان سے نکالی۔ اور گرج کر کہا۔ "سچ سچ بتا۔ تو کون ہے اور تجھے اندھیر نگری پر تہمتیں تراشنے کا کیا حق ہے؟"

نوجوان نے نہایت عاجزی سے جواب دیا۔ "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ سچ ہے۔"

"ثبوت؟" چوپٹ راجا نے غُرّا کر کہا۔

"ثبوت فراہم کر سکتا ہوں۔ اگر میرے ساتھ چلو۔"

"میں تیار ہوں۔"

نوجوان چوپٹ راجا کو ساتھ لے کر بازار کی طرف چل دیا۔ ایک دکان کے سامنے جس پر "خالی ہے" کا بورڈ آویزاں تھا۔ نوجوان رک گیا اور

دکاندار سے کہنے لگا۔ "مجھے یہ دکان چاہیئے۔ اس کا کیا کرایہ ہوگا"؟

"کرایہ تو بعد میں دیکھا جائیگا۔ پہلے نذرانہ کا فیصلہ کر لیجئے۔"

"نذرانہ"۔ چوپٹ راجہ نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں صاحب! نذرانے کے بغیر آپ کوئی چیز اس راجدھانی میں لے ہی نہیں سکتے۔"

"اچھا تو اس کا کرایہ اور نذرانہ جُدا جُدا بتلا دیجئے گا۔"

"کرایہ صرف ایک ٹکہ۔ نذرانہ پچاس ہزار ٹکے۔"

چوپٹ راجا پر جیسے بجلی گری۔ "یہ کیا مذاق ہے"؟ اس نے چیخ کر کہا۔

"مذاق نہیں صاحب یہ دستور ہے!"

"تو کیا ہمیں واقعی نذرانہ ...."

"جی ہاں! اگر آپ کی جیب میں پچاس ہزار ٹکے ہیں تو شوق سے یہ دکان لے لیجئے۔"

"ورنہ"؟

"اپنا راستہ پکڑ لیجئے۔"

چوپٹ راجہ اور نوجوان منہ لٹکائے وہاں سے آگے چل پڑے۔ جونہی وہ چوک کے قریب پہنچے انہیں رونے اور چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پہلے ایک چیخ۔ پھر دوسری۔ تیسری۔ چوتھی۔ اس کے بعد تو گویا کہرام مچ گیا۔ تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے وہ دونوں چوک میں پہنچے۔ یہاں آکر

دیکھا کہ ننگ دھڑنگ لوگوں کا ایک ہجوم ہے - اس ہجوم میں بچے عورتیں جوان بوڑھے سبھی شامل ہیں - اور سپاہی ان کی پیٹھ پر زور زور سے کوڑے برسا رہے ہیں - چوپٹ راجا نے ایک سپاہی سے پوچھا " ان لوگوں کو کیوں زدوکوب کیا جا رہا ہے - کیا انہوں نے چوری کی ہے "؟

" نہیں "

" ڈاکہ مارا ہے "؟

" نہیں "

" کسی کو قتل کیا ہے "؟

" نہیں "

" تو پھر " اس نے تلملا کر کہا " انہیں کیوں پیٹا جا رہا ہے "؟

" انہوں نے ایک ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ سنو گے - تو حیران رہ جاؤ گے " سپاہی نے جواب دیا -

" وہ کونسا ایسا جرم ہے "؟

" ان خبیثوں نے بھوک سے تنگ آکر چلّانا شروع کر دیا ہے "

" یہ تو ایک نہایت فطری سی بات ہے "

" فطری سی بات! ہاہاہا! تم بھی ایک مسخرے ہو - بھلا بھوک سے تنگ آکر چلّانا کہاں کی شرافت ہے "

" اگر کسی شخص کو بھوک لگے - روٹی نہ ملے - تو پھر وہ کیا کرے "؟

" کیا کرے! ہاہاہا! چونچ کو پیروں تلے دبا کر گھٹ کر مر جائے "

"لیکن میں نے سنا ہے کہ اس شہر میں گیہوں اور چاول ٹکے سیر بک رہے ہیں۔ پھر یہ لوگ خواہ مخواہ کیوں بھوکے مرتے ہیں؟"

"تم بھی یار واقعی ہونق ہو۔ یہ لوگ اتنے کمینے ہیں کہ ان کی جیبوں میں ایک ٹکہ بھی نہیں؟"

چوپٹ راجا اور اس کا ساتھی یہ ٹکا سا جواب سُن کر وہاں سے آگے چلے۔ بازار کے سِرے پر انہیں ایک بڑھیا ملی جس نے آہ وفغاں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ چوپٹ راجہ نے اس کے قریب جاکر نہایت ہمدردی سے پُوچھا "بہن تمہیں کیا رنج پہنچا۔ جو تم اتنی دردناک آواز میں فریاد کر رہی ہو؟"

بڑھیا نے چھاتی پر دوہتڑ مارتے ہوئے جواب دیا "اے لوگو! مَیں لُٹ گئی۔ برباد ہوگئی"

"لیکن ہُوا کیا؟ آخر بات تو بتاؤ" چوپٹ راجا نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"تم سنو گے میری بیتا" بوڑھی عورت نے ذرا صبر سے کہا "سُننے کے لئے کلیجہ کہاں سے لاؤ گے"؟ وہ سر پیٹ کر رونے لگی۔

"پھر بھی بتاؤ تو سہی شاید ہم کچھ تمہاری مدد کر سکیں" نوجوان نے نہایت نرمی سے کہا۔

"تو سنو۔ میں ایک غریب مزدور کی بیوی تھی۔ پچھلے دنوں جب قریب قریب تمام لوگ پاگل ہوگئے۔ تو چند آدمیوں نے جن سے میری کوئی

عداوت نہ تھی میرے گھر پر حملہ کر دیا۔ میرے خاوند کو گولی مار دی اور میری نوجوان کنواری لڑکی کو ۔۔۔۔۔۔۔۔ بڑھیا کا دل بھر آیا اور وہ پھر آنسو بہانے لگی۔

"ہاں ہاں! پھر کیا ہوا؟"

"میری نوجوان لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔ اور اندھیر نگری کے بڑے بازار کے چوک میں اس کے کپڑے اتار اس کی عصمت کو نیلام کرنا شروع کر دیا۔"

"پھر؟"

"پھر اسی نگری کے ایک شخص نے ایک ٹکے کے عوض اس کی عصمت کو خرید لیا۔"

"ایک ٹکے میں؟" چوپٹ راجہ نے حیران ہو کر کہا "عصمت کی قیمت صرف ایک ٹکہ؟"

"ہاں" بڑھیا نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ اس نگری میں یہی دستور ہے۔"

چوپٹ راجا اور اس کا ساتھی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے اور انہوں نے محل میں پہنچ کر دم لیا۔ جب ان کے ہوش و حواس بجا ہوئے تو چوپٹ راجا نے نوجوان کو اپنا تیز رفتار گھوڑا پیش کرتے ہوئے کہا "جتنی جلدی ہو سکے۔ اندھیر نگری سے بھاگ جا۔"

اور کہا جاتا ہے کہ اس رات چوپٹ راجا نے اپنی مہارانی کی لمبی زلف کا پھندا اپنے گلے میں ڈال کر خودکشی کر لی۔

گبارِ کھاتر

(پنڈت اَب ٹل کلام آجاسے مجرت (معذرت) کیساتھ)

شپھیکے موہ ترم (شفیقِ محترم)!

سے انکلابات ہیں جمانے کے۔ کہاں کِلا (قلعہ) احمد نگر کہاں دِلّی! کل اسیرے دامے فرنگ تھا۔ آج اسیرے کھمے (خمِ) جلفے (زلفِ) ہندی ہوں۔ ارتھات یعنی "بھارت ورش کے شکھشا منتری کی حیثیت سے ہندی جبان کا پرچار کر رہا ہوں۔ شکھشا منتری؟ جانے تمہاری بلا۔ بھئی وجیر سے تالیم۔ ماف کیجئے گا شپھیک کہ اُردو میں کھت لکھنے کے بجائے ہندی بھاشا میں پتر لکھ رہا ہوں۔ یہ تو تم نے سُن ہی لیا ہوگا کہ ۲۶ نومبر کو

دلی میں اُردو کی فاتحہ پڑھی گئی۔ اور اُردو کا جناجا اسی ویرانے میں ٹھکانے لگادیا گیا۔ جہاں غالب مرحوم کی کبر ہے۔ بات تو کچھ عجیب سی تھی۔ لیکن جن حجرات نے اس جناجے کو کندھا دیا۔ ان سب میں یہ فکیر (فقیر) پیش پیش تھا کہ اس فکیر کو اُردو مرحوم سے ہمیشہ اکیدت (عقیدت) رہی۔ ہائے اُردو! وائے اُردو! جی چاہتا ہے۔ آدت سے بھی مجبور ہوں۔ کہ کوئی پھڑکتا ہوا شیر (شعر) لکھوں کہ جسے پڑھ کر تمہاری رُوح لرج اٹھے۔ لیکن افسوس صد افسوس! ہندی جبان میں کوئی وجندار شیر نہیں ملتا۔ کبیر بھگت کا ایک دوہا ہے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہاڑ جلے جوں لکڑی کیس جلے جوں گھاس
جلتی چتا دیکھ کے بھئے کبیر اُداس

کہو گے تو سہی کہ سادی (سعدی) حافج (حافظ) اور گالب (غالب) جن کے مجھے لاکھوں اشآر یاد ہیں کیا ہوئے لے دے کے کبیر بھگت کیوں؟ جانے من (جانِ من) ہندی جبان میں ع، غ، ظ سِرے سے ہی مفکود ہیں۔ اگر ان شورا (شعرا) کے اشآر ہندی میں لکھے جائیں تو الفاج (الفاظ) اجیب و گریب شکلیں اکھتیار کر لیتے ہیں۔ مسال کے طور پر گالب کے اس شعر کے ترجمے "کا بکس منہ سے جاؤ گے گالب "مے سے گرج نشانت ہے کس رُوسیاہ کو"۔ صاف جاہر ہے کہ یہ اشآر ہندی میں نہیں لکھے جا سکتے۔ ہاں یاد آیا۔ ان دنوں دیوانِ گالب (دیوانِ غالب) کا ہندی ایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ پڑھو گے تو دانتوں میں انگلیاں دبا کر

رہ جاؤ گے!

بہت دنوں کے بعد خط لکھنے کی توفیق ہوتی ہے۔ وجہ یہ کہ بہت
مصروف رہا ہوں۔ بارے آج کچھ فرصت ملی۔ متالہ (مطالعہ) کا یہ حال
ہے کہ اس کے بھی جب تمہیں خط لکھ رہا ہوں تلسی رامائن نجر کے
سامنے ہے۔ سامنے کی الماری میں رکھا ہوا "دیوانے حافج" میری طرف
اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ لیکن کیا کروں بھارت کے شکھشا
منتری ہونے کی حیسیت سے مجھے یہ جیب (زیب) نہیں دیتا کہ حافج
کا شیدائی ہوتے ہوئے بھی دیوانے حافج پڑھ سکوں۔ کسی ملاقاتی نے دیکھ لیا
تو گجب ہو جائیگا۔ بھارت ورش کے اکھباری ہلکوں میں ہلچل مچ جائے گی۔
کہ آجاد بھارت ورش کا شکھشا منتری آجاد جلسوں اور اسمبلیوں میں لوگوں
کو ہندی سیکھنے کی ترگیب دیتا ہے کھد چھپ چھپ کر دیوانے حافج پڑھتا ہے۔
ٹھیک! سمے سمے کی بات ہے کل گالب کا دور تھا۔ آج تلسی داس کا
ہے دل پر جو گجرتی ہے سو گجرتی ہے۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں لیکن حالات کا
تکاجا یہی ہے کہ دن رات ہندی پڑھے جاؤں اور اپنی اردو کھراب کئے جاؤں
سچ کہا ہے تلسی داس نے

برو مرال بانس تجے چند رشیت روی گھام   موہ مداد کے جو تجے۔ تلسی تجے نہ رام

اس شعر کے کیا مانے (معنی) یہ تو میں کھد نہیں جانتا لیکن اسے ٹھیک الی گڑھ میں
کوئی پنڈت تو جرور ہوگا۔ اس سے پوچھ لیجئے گا اور اگر ہو سکے تو مولانا ابل کلام کی یاد
میں دو آنسو بہا دیجئے گا کہ کبھی اس کی اردو کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی۔

آپ کا [illegible] ابل کلام آجاد

آزادی کی قسم

میں ترنگے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ "باپو" کے بلیدان کو کبھی نہیں بھولونگا۔ لیکن "باپو" کے بتائے ہوئے اصولوں پر کبھی عمل نہیں کرونگا۔ میں بات بات میں گاندھی جی کی دہائی دونگا۔ لیکن مجھے گاندھی جی کی دہائی دی جائے گی۔ تو میں اس کی بالکل پرواہ نہیں کرونگا۔ ایک سچے دیش بھگت کی طرح دیش کا روپیہ اس وقت تک برباد کرتا رہونگا۔ جب تک کہ دیش کا دیوالہ نہیں پٹ جاتا۔ بوڑھا۔ اندھا یا بہرہ ہو جانے کے بعد چاہے مجھے لاٹھی کے سہارے یا اسٹریچر پر سوار ہو کر آنا پڑے۔ میں ریٹائر ہونا پسند نہیں کرونگا اور تب تک گدی سے چمٹا رہونگا جب تک کہ میرا جنازہ دفتر سے نہیں نکلتا۔ میں تقریروں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کرونگا۔ جو کبھی ختم ہونے کا نام نہ لے گا اپنی ہر تقریر میں وہی بات کہونگا جو میں نے اس سے پہلی تقریر میں کہی ہوگی۔

چاہے نتیجے کے طور پر لوگ تنگ آ کر میری تقریر سُننا چھوڑ ہی کیوں نہ دیں۔ جب تک دم میں دم ہے میں کسی نوجوان کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دونگا۔ جب تک کہ وہ میرا نزدیکی رشتہ دار نہ ہو۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ــــــــــ

میں بھول کر بھی ایسا کوئی کام نہیں کرونگا جس سے جنتا کو فائدہ پہنچنے کی اُمید یا امکان ہو سکتا ہو۔ مانا کہ جنتا اب کافی سمجھ دار ہو چکی ہے۔ اور اسے بیوقوف بنانا آسان نہیں۔ پھر بھی میں اسے بیوقوف بنانے کی کوشش کرونگا۔ جو لوگ میری باتوں میں آنے سے انکار کرینگے۔ میں انہیں عمر بھر کے لئے جیل خانہ میں بھجوا دونگا۔ اور قیامت تک یہ نہیں بتاؤنگا کہ انہوں نے کونسا قصور کیا ہے۔ جتنے اسٹاف کی مجھے ضرورت ہوگی اس سے چوگنا رکھونگا۔ لیکن پھر بھی یہ شکایت کرتا رہونگا۔ کہ آدمیوں کی کمی کے باعث کوئی کام وقت پر نہیں ہو رہا۔ جنتا کی ہر شکایت کو بڑے غور سے سنونگا۔ اور سننے کے بعد بھول جاؤنگا۔ کہ وہ شکایت کیا تھی۔ کھانے پینے کی تمام اشیاء پر کنٹرول لگاؤنگا۔ اور اس کے بعد جب وُہ چیز بازار سے غائب ہو جائے گی تو اس کا سبب یہ بتاؤنگا کہ راتوں رات ملک کی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جنتا کو وہ چیز پوری مقدار میں نہیں دلائی جا سکتی۔ خوراک کی کمی پوری کرنے کے لئے ہر شخص سے درخواست کرونگا کہ وہ ہفتہ میں صرف ایک دن کھانا کھایا کرے اور باقی کے چھ دن پیٹ پر پتھر باندھ کر سو جایا کرے۔ کپڑے کا توڑا اس طرح پورا کرونگا۔ کہ کپڑے کے دام حد سے زیادہ

بڑھادونگا ۔ تاکہ کوئی شخص کپڑا خرید ہی نہ سکے ۔ بڑے بڑے پوسٹر لگوا کر جنتا کو سمجھاؤنگا کہ فاقہ کرنا یا ننگا رہنا صحت کے لئے کس قدر ضروری ہے ۔ سب سے بڑا کام یہ کرونگا ۔ کہ ملک میں نہیں کروڑ نئے درخت لگواؤنگا ۔ ان سے یہ فائدہ ہوگا کہ اتنی بارش ہوگی کہ نوح کے طوفان کی یاد تازہ ہو جائے گی ۔ فصلیں ——— اگر بچ طوفان میں بہنے سے بچ گئے ۔ ——— بوئی جائیں گی اور اتنا اناج پیدا ہوگا کہ جنتا کھا کھا کر بدحواس ہو جائے گی ۔

دیش کی دولت بڑھانے کے لئے اپنے ہر ایک دوست کو امپورٹ لائسنس دلاؤنگا ۔ جس سے وہ امریکہ سے سستی کتابیں اور مہنگی شراب منگوا کر غیر مناسب داموں پر فروخت کرے ۔ اس طرح میرے دوستوں کے پاس بہت سا روپیہ جمع ہو جائے گا ۔ اور ملک بہت جلد مالا مال ہو جائیگا ۔ غریبوں کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہونگا ۔ اگر وہ بغاوت کرینگے ۔ تو مذہبی کتابوں کے حوالے دے دے کر سمجھاؤنگا ۔ کہ جو غریب اپنا حق مانگتا ہے وہ سیدھا نرک میں جاتا ہے ۔ جاگیرداری ختم کر دونگا ۔ مگر جاگیرداروں کو کسانوں سے اتنا روپیہ دلواؤنگا ۔ جس سے وہ نئی جاگیریں خرید سکیں ۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ———

آزادیٔ تحریر و تقریر کو بالکل ختم کر کے چھوڑ دونگا ۔ چاہے مجھے سارا ORDINANCES تبدیل کرنا پڑے یا PENAL CODE کا سہارا

لینا پڑے۔ اس نیک کام کے لئے نئے آئین میں تین نئی مدوں کا اضافہ کرونگا۔

(۱) ہر مرد یا عورت کو سمن، وارنٹ اور جرم کے بغیر کسی بھی وقت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

(۲) مجرم کو عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا تا کہ وہ اپنا بے قصور ہونا ثابت ہی نہ کر سکے۔

(۳) مجرم کو ایک بار رہا کر کے پھر گرفتار کیا جائیگا۔ یہ گرفتاری جیل کے دروازہ پر عمل میں لائی جائیگی۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ــــــــــ

اپنی غلطیوں کے لئے میں خود کو قصوروار نہیں ٹھہراؤنگا۔ زور زور سے چلّا کر کہونگا کہ گاڑیاں اس لئے دیر سے آتی ہیں کیونکہ انجن بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کھانڈ اس لئے نہیں ملتی کہ گنوں نے زمین سے اگنا بند کر دیا ہے۔ رشوت بڑھ رہی ہے۔ کیونکہ لوگوں کو رشوت دینے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ اناج کا توڑا اس لئے ہے کہ سارا اناج چوہے کھا گئے ہیں۔ اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے چاہے مجھے کتنا جھوٹ بولنا پڑے۔ میں بولوں گا۔ کیونکہ فتح آخر جھوٹ کی ہوتی ہے۔ اہنسا کے اُصول پر اس حد تک عمل کرونگا۔ کہ بجٹ کا صرف ساٹھ فی صدی حصہ جنگ کا سامان خریدنے پر صرف کرونگا۔ سچ۔ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ مگر سچی بات نہ کبھی خود کہونگا نہ کسی اور کو کہنے دونگا۔

شراب نہیں پیوں گا۔ شراب کے بجائے غریبوں کا خون پی پی کر گذارہ کرونگا۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ——————

میں یہ سب دلچسپ حرکتیں کرونگا۔ اور ان سے بھی زیادہ دلچسپ حرکتیں کرنے کو تیار رہونگا۔ اگر سورگ لوک "باپو" مجھے برا بھلا کہیں گے یا میری بے شرمی پر آنسو بہائیں گے تو میں جان بوجھ کر بہرا اور اندھا بن جاؤنگا۔

آزادی کے دن میں عزم کرتا ہوں کہ

میں دیش کو تباہ کر کے دم لونگا۔ پرماتما مجھے ہمت اور توفیق دے کہ میں اپنے عزم کو پورا کرسکوں۔

اس دن جب مجھے وزیر ٹکیس کا خط ملا تو میں بہت حیران ہوا۔ وزیر ٹکیس سے میری رسم و راہ تک نہ تھی۔ اور مجھے سان گمان نہیں تھا کہ وہ مجھے نہ صرف خط لکھے گا بلکہ اپنے یہاں چائے پر مدعو بھی کرے گا۔ وزیر ٹکیس نے لکھا تھا۔

محترمی!

مجھے آپ کی آج بہت ضرورت ہے۔ اگر ہو سکے۔ تو چار بجے میرے یہاں تشریف لائیے اور میرے ساتھ چائے پیجئے۔ آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔

مخلص:۔
وزیر ٹکیس

یہ خیال کرتے ہوئے کہ وزیر ٹیکس جیسے سمجھدار آدمی سے ضرور کوئی غلطی ہوتی ہے یعنی اس نے یہ دعوت نامہ کسی اور کو بھجوانے کی بجائے مجھے بھجوا دیا ہے۔ پہلے تو میں اس کے ہاں جانے سے جھجکا۔ لیکن جب تین بجے وزیر ٹیکس کے سکریٹری نے فون پر مجھ سے وقت مقررہ پر پہنچ جانے کی درخواست کی تو میں یہ سمجھا کہ وزیر ٹیکس ضرور کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہے اور اسے میرے مشورے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں ٹھیک چار بجے اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

"جے ہند۔ مزاج کیسے ہیں؟ آج موسم خوشگوار ہے۔ تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ"! وغیرہ وغیرہ رسمی باتوں کے بعد وزیر ٹیکس مجھے اپنے ڈرائینگ روم میں لے گئے۔ اور ایک پُرتکلف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیرا چائے لایا۔ وزیر ٹیکس نے میرے لئے چائے کا پیالہ بناتے ہوئے کہا..... "آپ حیران ضرور ہونگے کہ میں نے آپ کو بلوا بھیجا۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مجھے واقعی آپ کی ضرورت ہے"۔

"فرمایئے"! میں نے عاجزی سے کہا "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ بڑے ذہین آدمی ہیں"۔

"صاحب! میں کیا ہوں۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے"۔

"کسر نفسی کی ضرورت نہیں۔ آپ واقعی بڑے ذہین آدمی ہیں۔

اور مجھے اس وقت واقعی ذہین آدمی کی ضرورت ہے"۔

"فرمائیے!"

"آپ جانتے ہیں میں خسارے کا بجٹ تیار کرنے میں ماہر ہوں"۔

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تین سال ہوئے آپ نے بجٹ میں پچاس کروڑ کا خسارہ دکھایا تھا۔ پچھلے سال ستّر کروڑ۔ اور اس سال تو آپ نے اپنے تمام پچھلے ریکارڈ مات کر دیئے۔ یعنی ننانوے کروڑ!"

"بس اسی کے متعلّق آپ سے مشورہ کرنا ہے"۔

"گستاخی معاف! لیکن مجھے بجٹ تیار کرنے کا کوئی تجربہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنا ذاتی بجٹ تیار کرنے میں بھی اکثر ناکام رہتا ہوں۔ اسی کو لیجئے۔ کہ آج مہینے کی بیس تاریخ ہے اور میرے بٹوے میں صرف ایک کھوٹی چوّنی ہے اور ابھی بجلی کا بِل۔ درزی کا بِل۔ دھوبی کا بِل۔ اور اسی قسم کے متعدد اور بِل مجھے ادا کرنے ہیں۔ اس حالت میں۔۔۔"

"چھوڑیئے یہ قصّہ" وزیرِ ٹیکس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ کے بٹوے میں کم از کم کھوٹی چوّنی تو ہے۔ یہاں میرے خزانے میں پھوٹی کوڑی تک نہیں"۔

"عجیب بات ہے۔ لیکن آپ اتنے نئے ٹیکس ہر سال لگاتے ہیں۔ وہ روپیہ کہاں جاتا ہے"؟

"آپ بھی عجیب سادہ لوح ہیں"۔ وزیرِ ٹیکس نے ذرا بے تکلّف

ہوتے ہوئے کہا ——— "یہ بھی نہیں جانتے کہ اگر ادھر میں نئے ٹیکس لگاتا ہوں تو ادھر فوراً اخراجات بڑھا دیتا ہوں۔ اس حالت میں خزانے میں کچھ بچ رہنے کے کیا امکانات ہیں۔"

"لیکن آپ اخراجات کیوں بڑھاتے ہیں؟" مَیں نے ذرا چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا۔

"اخراجات نہ بڑھاؤں۔ تو خسارہ کیسے دکھا سکتا ہوں؟"

"خسارہ نہ دِکھایئے"۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"خسارہ نہ دکھاؤں؟" وزیر ٹیکس نے چمک کر کہا۔ "تو پھر وزیر ٹیکس کیسے رہ سکتا ہوں؟ پھر تو مجھے وہی کام کرنا پڑے گا۔ جو پیشتر آیا ہے۔"

"یعنی ———؟"

"خیر چھوڑیئے یہ قصّہ۔ ہاں تو بات یہ ہے کہ مجھے اخراجات بڑھانا ہی پڑتے ہیں۔ دراصل مَیں اس معاملہ میں کچھ مجبور سا ہوں۔ اب اس سال ہی دیکھئے......"

"ہاں ہاں اس سال...."

"اس سال میں نے نو نئے وزیر مقرّر کئے۔ دس نئے سفیر غیر ممالک میں بھیجے۔ پانچسو نئے سکریٹری تعینات کئے۔ ساڑھے سات سو ڈپٹی سکریٹری۔ پندرہ سو اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹری اور اگر سب اسسٹنٹ ڈپٹی سکریٹریوں کی تعداد پوچھو تو شاید بتا بھی نہ سکوں۔"

"نو وزیر! دس سفیر! یہ تو ناقابلِ یقین سی بات معلوم ہوتی ہے"۔

"ناقابلِ یقین؟ اچھا گن لیجئے ———— وزیر قحط۔ وزیر وعدہ وزیر تقریر، وزیر جلسہ، وزیر جلوس، وزیر جیل، وزیر مذاق، وزیر حادثہ، وزیر اعداد و شمار"۔

"اور سفیر کون سے نئے ممالک میں بھیجے؟"

"ان ممالک کے نام تو مجھے بھی اچھی طرح نہیں آتے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اب دُنیا کے کونے کونے میں ہمارے سفیر ہیں۔ مثلاً ایک جزیرہ "جگ نگ نگ جگ" ہے۔ بحر الکاہل میں ہے یا شاید بحر اوقیانوس میں۔ اس کا رقبہ صرف ایک مربع میل ہے۔ آبادی پچاس ساٹھ کے قریب ہوگی۔ وہاں میں نے ابھی ابھی ایک سفیر کو تعینات کیا ہے"۔

"لیکن یہ نئے وزیر اور سفیر کچھ کام بھی کرتے ہیں یا محض اخراجات بڑھانے کے کام آ رہے ہیں؟"

"اخراجات بڑھانا ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی یہ اور بہت سے کام انجام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پہ وزیر قحط کو لیجئے"۔

"ہاں ہاں! اِن حضرات کا کیا کارنامہ ہے؟"

"ان کا کارنامہ یہ ہے کہ یہ ملک کی ہر چھوٹی بڑی ریاست پر قحط مسلّط کر رہے ہیں۔ ابتدا انہوں نے ایک شمال مشرقی ریاست سے کی ہے۔ لیکن انتہا کہاں کریں گے۔ اس کا علم ان کے سوا کسی کو نہیں۔ یہ حضرت

جب چاہیں کسی قسم کے قحط کو معرضِ وجود میں لا سکتے ہیں۔ خوراک کا قحط۔ کپڑے کا قحط۔ مٹی کے تیل کا قحط یا محض مٹی کا قحط!"

"خوب!" میں نے مسکرا کر کہا ——— "اور وزیرِ مذاق؟"

"ہاہا! وزیرِ مذاق! بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ ان کا کام عوام سے مذاق کرنا ہے۔ جوں ہی کوئی مسئلہ عوام کی پریشانی کا باعث بنتا ہے۔ اور ان کی توجہ اس کی طرف دلائی جاتی ہے یہ اسے ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"اگر عوام شکایت کریں کہ چائے حد سے زیادہ مہنگی ہو گئی ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ اگر چائے مہنگی ہو گئی ہے تو چائے کی بجائے سوکھی گھاس کا جوشاندہ پیا کیجیے۔"

"واقعی وزیرِ مذاق بڑے بامذاق واقع ہوئے ہیں!"

"جی ہاں! یہ بات نہ ہوتی تو میں انہیں پانچ ہزار ماہانہ پر تعینات نہ کرتا۔ خیر چھوڑیئے یہ قصہ۔ ہم اصل موضوع سے بھٹک رہے ہیں۔ دراصل میں نے آپ کو اس لئے نہیں بلوایا کہ نئے وزیروں یا سفیروں کے کارناموں سے آگاہ کروں۔ میرا مطلب کچھ اور تھا۔"

"ارشاد!"

"آپ چونکہ ذہین آدمی ہیں۔ اس لئے ذرا اپنے دماغ سے کام لیجیے۔ اور مجھے بتلایئے کہ ننانوے کروڑ روپے کے خسارے کو پورا کرنے کے

لئے کون کون سے نئے ٹیکس لگانے جا رہے ہیں ——— ؟"

"نئے ٹیکس! گستاخی معاف!" میں نے ذرا بھنا کر کہا ——— "پہلے ہی آپ نے ٹیکس لگا لگا کر عوام کی کمر کبڑی کر دی ہے۔ خدارا نئے ٹیکس لگانے کے ارادے سے باز آئیے"

"عوام پر ٹیکس؟ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں نے عوام پر تو کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔ یہ صحیح ہے میں نے تمباکو پر ٹیکس لگایا۔ پان پر لگایا۔ لیکن عوام تمباکو ہیں نہ پان"

"ظالم"! میں نے وزیر ٹیکس سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹیکس عوام پر ہی تو ہیں۔ عوام پان یا تمباکو نہ سہی لیکن پان کھاتے اور تمباکو پیتے تو ہیں"

"یہ اور بات ہے۔ اچھا چھوڑیئے یہ قصہ۔ اب جلدی جلدی بتایئے۔ کہ کون سے نئے ٹیکس ...... ؟"

"آپ ٹیکس لگانے پر مصر ہیں؟"

"بالکل ———"

"ضرور لگانا چاہتے ہیں؟"

"ضرور ———"

"اچھا تو سگائی کے متعلق کیا خیال ہے ؟"

"سگائی؟ کس کی سگائی؟ میری یا آپ کی؟"

"ہاہا! واہ وزیر ٹیکس صاحب! آپ ہیں تو وزیر۔ لیکن معاف

کیجئے گا۔ ہیں نرے کاٹھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

" بس بس آگے مت کہیئے۔ مَیں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن سگائی کا ٹیکس سے کیا تعلّق ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔"

" میرا مطلب ہے سگائی ٹیکس"۔

" اچّھا۔ اچّھا سگائی ٹیکس۔ خوب۔ خوب! بہت دُور کی سُوجھی بھئی واہ کیا بات ہے۔ سگائی ٹیکس۔ واقعی آپ ذہین ترین آدمی ہیں"۔

" آپ کی ذرّہ نوازی ہے"۔

" اچھا بھلا اندازاً بتائیے۔ آپ کے ملک میں ہر سال کتنی سگائیاں ہوتی ہیں"؟

" یہ تو کِسی پنڈت سے دریافت کیجئے"۔

نہیں نہیں۔ مذاق چھوڑیئے۔ بتائیے"۔

" کوئی دس بارہ لاکھ"

" ٹھیک! اگر ہر سگائی پر دس روپے ٹیکس لگایا جائے تو ایک کروڑ سے کچھ زیادہ آمدنی ہوسکتی ہے۔ اچھا اور کوئی ٹیکس تجویز کیجئے"۔

" پیدائش ٹیکس"۔

" بہت خوب۔ بہت خوب! میرے خیال سے اپنے ملک میں ہر سال پچاس لاکھ نئے بچّے پیدا ہوتے ہیں۔ پانچ روپے فی بچّہ ٹھیک رہے گا"۔

"زیادہ ہے۔ غریب لوگ نہیں دے سکیں گے۔"

"تو پونے پانچ کر دیجئے۔ پچاس لاکھ ضرب پونے پانچ ——— کافی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اب آگے چلئے۔"

"کفن ٹیکس۔"

"ہاں ہاں کفن ٹیکس! کیوں نہیں اگر پیدائش ٹیکس لگ سکتا ہے۔ تو کفن ٹیکس لگانے میں کیا مضائقہ ہے۔ اس ٹیکس سے بھی پچاس ساٹھ لاکھ کی رقم دستیاب ہو سکتی ہے۔ چلئے یہ بھی نوٹ کر لیا۔ اور . . ."

"بکری ٹیکس"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جو شخص بکری پالے اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ آجکل گائے یا بھینس پالنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس ٹیکس کا دائرہ ذرا وسیع ہونا چاہئے۔ کتنے ہی لوگ مرغیاں۔ بٹیریں۔ بطخیں۔ طوطے۔ کتے۔ بلیاں اور چوہے بھی تو پالتے ہیں۔"

"تو چلئے بکری ٹیکس کے علاوہ بٹیر ٹیکس۔ چوہا ٹیکس۔ مرغی ٹیکس بھی لگا دیجئے۔"

"اچھا اب کوئی ایسی چیز بتائیے جسے ہر شخص استعمال کرتا ہو۔ میری رائے میں اگر اس پر ٹیکس لگایا جائے۔ تو معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔"

"سوچنا پڑے گا۔"

"ہاں ہاں دو تین منٹ سوچ لیجئے۔ میں اتنے میں سگریٹ پیتا ہوں۔"

دو تین منٹ کے وقفہ کے بعد میں نے کہا...... "میرے خیال میں ایسی صرف دو چیزیں ہیں۔"

"فرمایئے"

"شیشہ اور کنگھی"

"شیشہ اور کنگھی" !وزیر ٹیکس نے کرسی پر اچھلتے ہوئے کہا ——
"آپ واقعی ذہین ترین آدمی ہیں۔ شیشہ اور کنگھی! کنگھی اور شیشہ کیا بات ہے واللہ!"

"اگر آپ ان دونوں پر ٹیکس لگا دیں، چاہے معمولی سا، تو کروڑوں کی آمدنی ہو سکتی ہے۔"

"کروڑوں؟ وارے نیارے ہو جائیں گے...... اچھا اب ایک منٹ کے لئے دماغ کو پھر آزمائش میں ڈالیئے۔ اور سوچ کر بتایئے کہ کوئی ایسی چیز رہ تو نہیں گئی جس پر ہم نے ٹیکس نہیں لگایا۔ آپ بھی سوچئے۔ میں بھی سوچتا ہوں۔"

چند ثانئے ہم دونوں خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔ معاً وزیر ٹیکس نے کہا —— "ایک چیز کا تو مجھے پتہ چل گیا ہے۔ باقی آپ بتا دیجئے۔"

"وہ کونسی چیز ہے؟"

"برف!"

"برف؟"

"ہاں ہاں بھئی برف! جانتے نہیں گرمی کے موسم میں ہر آدمی برف استعمال کرتا ہے!"

"خوب! بہت خوب!" میں نے وزیر ٹیکس کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب آپ کہئے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"میرے خیال میں تو ابھی بہت سی چیزیں باقی ہیں۔ مثال کے طور پر غرارہ" ——

"آپ کا مطلب ہے ریشمی غرارہ؟"

"ہاں!"

"اس پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا!"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ ——" وزیر ٹیکس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "شریمتی جی پہنتی ہیں!"

"تو رہنے دیجئے —— حنا کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"حنا پر ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔ حنا سے شریمتی جی کو خاص طور پہ نفرت ہے!"

"خضاب؟"

خضاب پر ٹیکس لگانا ٹھیک نہیں رہیگا۔ والد محترم خضاب لگاتے

ہیں ۔۔۔۔۔ خضاب کے علاوہ کوئی اور چیز بتائیے!"

"عینک، چھتری، بٹوا، چاقو، چمچہ، دیگچی، لحاف، رضائی، تکیہ، تولیہ، جھومر، نتھ، بازوبند، گھڑی، فونٹن پین، ہلدی، مرچ، دارچینی، گرم مصالحہ ۔۔۔۔۔۔"

"بس بس کافی ہیں۔ میرے خیال میں ننانوے کروڑ کا خسارہ پورا ہو جائے گا۔"

"اگر اب بھی پورا نہ ہوا۔ تو پھر دھوپ اور پانی پر بھی ٹیکس لگا دیجئے گا۔"

"نہیں نہیں ـــــ میرے خیال میں اس سال یہ نوبت نہیں آئیگی۔ اگلے سال دیکھا جائیگا۔"

"اچھا تو اب مجھے اجازت ہے؟"

"بہت بہت شکریہ"۔ وزیر ٹیکس نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے فرمایا۔ "آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ نہ صرف ذہین بلکہ ذہین ترین آدمی ہیں۔"

نیا شکنجہ!

پارلیمنٹ میں ایک نہایت اہم تقریر

مسٹر سپیکر! پارلیمنٹ کا یہ غیر ضروری اجلاس ہے، اسے منعقد کرنے کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ ملک کی بدقسمتی سے انتخابات میں ہم نے بھاری اکثریت حاصل کر کے پارلیمنٹ میں ایسی مضبوط پارٹی بنا لی ہے کہ ہم اقلیت کے معقول سے معقول مطالبے بھی رد کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ بہت دنوں سے کر رہے ہیں اور تھوڑے دن اور کر سکیں گے۔ اس غیر ضروری اجلاس میں غیر قانونی نقطے پیش کئے جائیں گے "قانونی" کہنا بھی تکلف ہے۔ ورنہ وہ نقطے ایسے ہیں کہ ان کا کسی قانون سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ نقطے کسی ایسی پارلیمنٹ میں پیش کئے جاتے جس کے افراد

ذی ہوش اور سمجھ دار انسان ہوتے تو شاید دہلی کی بجائے مجھے آگرہ میں منتقل کر دیا جاتا۔ تاکہ اپنے دماغی توازن ...... خیر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس ہاؤس میں ایسا کوئی خطرہ نہیں۔

ہاؤس کو یاد ہوگا۔ آخر ہاؤس کا حافظہ اتنا کمزور نہیں اور اگر کمزور ہو تو مجھے بخوبی یاد ہے۔ ہاؤس کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہاؤس کو یاد ہوگا کہ چند سال میرا مطلب ہے چند مہینے ہوئے۔ ہم نے ملک کے لئے ایک "نیا آئین" تیار کیا تھا۔ اس آئین کا ملک کے بے سمجھ حلقوں میں کافی خیر مقدم کیا گیا۔ چند غیر ممالک نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ یہ غیر ممالک وہ تھے جن کے آئین سے ہم نے کافی حصے حرف بحرف نقل کر لئے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ آئین مرتب کرتے وقت جلد بازی سے کام لیا گیا۔ ہاؤس کو یاد ہوگا کہ ہم نے اسے مرتب کرنے کے لئے محض تین سال کا مختصر عرصہ صرف کیا تھا۔ اس قلیل عرصے میں ایک معیاری آئین مرتب کرنا ناممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں کافی نقائص رہ گئے۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس آئین میں وقت بے وقت تبدیلیاں کرتے رہیں گے تاکہ چند صدیوں کے بعد یہ ایک معیاری آئین بن جائے۔

آج کے اجلاس میں ایک ترمیم پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ جرأت کا لفظ میں نے غلطی سے استعمال کیا ہے۔ دراصل جرأت کی بجائے "ڈھٹائی" زیادہ برمحل ہوگا۔

مسٹر سپیکر! میں آپ کی اجازت سے تجویز کرتا ہوں کہ اس نئی ترمیم

کا نام نیا شکنجہ رکھا جائے۔ (گورنمنٹ بنچوں سے تالیاں اور اپوزیشن سے شیم شیم کی آوازیں) میں سمجھتا ہوں۔ اور مَیں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ہاؤس بھی یہی سمجھتا ہے کہ کوئی بھی ترمیم۔ ترمیم کم اور شکنجہ زیادہ ہونی چاہیئے۔

حضرات! آپ نے تالی نہیں بجائی۔ حالانکہ تالی بجانے کا یہ نادر موقعہ تھا۔ بات یہ ہے ....

مسٹر سپیکر! کہ اس شکنجے کی عدم موجودگی میں گورنمنٹ کو بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سب سے بڑی مشکل تو یہی ہے کہ گو ہم کافی لوگوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ تاہم بہت سے ایسے لوگ ہیں جو گرفتار ہونے سے بچ گئے ہیں۔ جب تک وہ کسی جرم کا ارتکاب نہ کریں۔ گورنمنٹ انہیں گرفتار کرنے سے معذور ہے۔ لیکن مسٹر سپیکر! آخر گورنمنٹ کب تک انتظار کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جرم نہ کرے تو اُسے گرفتار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عجب اندھیر ہے یعنی گورنمنٹ تمام عرصہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہے۔ کہ کب کوئی شخص جُرم کرتا ہے۔ میں ہاؤس سے اپیل کرتا ہُوں کہ وُہ گورنمنٹ کی بے بسی ملاحظہ فرمائے۔ اور اس کے بعد فیصلہ کرے کہ آیا گورنمنٹ نیا شکنجہ مرتب کرنے میں حق بجانب ہے یا نہیں۔ (اپوزیشن۔ بالکل نہیں۔ بالکل نہیں)۔ مسٹر سپیکر! آپ اپوزیشن سے خاموش رہنے کے لئے کہیئے۔ کیونکہ اب مَیں مختصراً اس نئے شکنجے کی تشریح کرنا چاہتا ہُوں۔

نئے شکنجہ کی دفعہ ۱ کی رُو سے کسی شخص کو سچ بولنے کہنے یا لکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(توضیح) کانے کو کانا۔ اندھے کو اندھا۔ بہرے کو بہرا۔ قحط کو قحط۔ بدانتظامی کو بدانتظامی۔ رشوت کو رشوت۔ ٹیکس کو ٹیکس۔ چوربازاری کو چوربازاری کہنا سچ ہے۔ جو شخص بولنے۔ کہنے یا لکھنے کا مرتکب ہوگا اُسے فوراً نظربند کر دیا جائے گا۔ اگر وہ لیکھک ہے تو اس کا قلم توڑ دیا جائیگا۔ اور دوات ضبط کر لی جائے گی۔ اگر وہ سیاست دان ہے تو اسے غدار کا لقب دے کر بدنام کیا جائیگا۔ اگر وہ مقرر ہے تو اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔

مسٹر سپیکر! میرے خیال میں یہ سزائیں کافی عبرت ناک ثابت ہونگی۔ بین الاقوامی حالات بھی کچھ ایسے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ سخت سزائیں نہیں دے سکتے۔ ورنہ میرا تو خیال ہے کہ ایسے اشخاص کو زندہ جلا دیا جائے۔ تاکہ وہ سچ بولنے کی شرمناک عادت سے توبہ کریں۔

نئے شکنجے کی دفعہ ۲ کی رُو سے ہر اس شخص کو گرفتار کیا جائے گا۔ جس نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ لیکن جس سے جرم کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ حضرات! توقع کا لفظ غور طلب ہے۔ جرم کرنے کی توقع ہر شخص سے کہ جو ہماری پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔ کی جا سکتی ہے۔ صرف ہماری پارٹی ہی ایسی ہے جو جرائم کا ارتکاب کرتی ہوئی بھی جرائم کا ارتکاب نہیں کرتی۔ باقی سب پارٹیاں ایسی ہیں کہ ان کے افراد سے مہینے کی کسی تاریخ اور دن کے کسی وقت بھی جرم کرنے کی

توقع کی جا سکتی ہے ۔ شاید میں اپنا خیال آپ پر واضح نہیں کر سکا۔ اگر آپ اسے ڈھٹائی نہ سمجھیں تو میں یہ کہنے کی جرأت کرونگا کہ ہم محض شک کی بنا پر بہت سے لوگوں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ شک کی چند مثالیں دے کر میں یہ لفظ اور زیادہ واضح کرنے کی کوشش کرونگا۔

(۱) آپ اس وقت پاگل نہیں ہیں ۔ لیکن ہمیں شک ہے کہ آپ کسی وقت بھی پاگل ہو سکتے ہیں ۔ اس لئے پاگل خانہ ...... بھجوا دینے میں آپ کی بھلائی ہے ۔

(۲) آپ کی بیوی کا چال چلن ٹھیک ہے ۔ لیکن نہ معلوم وہ کس وقت کسی غیر آدمی کے ساتھ بھاگ جائے ۔ اس لئے آپ کو ابھی سے اسے طلاق دے دینا چاہیئے ۔

(۳) آپ کا مکان اچھی حالت میں ہے لیکن کون جانتا ہے کہ کب اس کی چھت نیچے آ رہے ۔ اس لئے مکان کو فوراً گرا دیجئے ۔

(۴) جس اجنبی سے ابھی ابھی آپ کا تعارف ہوا ہے وہ شریف آدمی ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ پندرہ منٹ کے بعد شرافت کو خیرباد کہہ کر آپ پر حملہ نہیں کرے گا ۔ اس لئے آپ اس پر فوراً حملہ کیجئے ۔

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا میں اپنے سوا یعنی اپنی پارٹی کے افراد کے سوا کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لئے "احتیاط علاج سے بہتر ہے" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ہمیں باقی تمام پارٹیوں کو نظر بند کر دینا چاہیئے ۔

نئے شکنجے کی دفعہ ۳۲ کی رُو سے گورنمنٹ کو ہر اس شخص کو گرفتار کرنے کا حق ہوگا۔ جس سے گورنمنٹ کو خواہ مخواہ ڈر لگتا رہتا ہے۔ مسٹر سپیکر! آپ اس بات سے انکار نہیں کرسکتے کہ ملک میں ایسے لوگوں کی بھاری تعداد موجود ہے۔ جن کے محض تصور سے گورنمنٹ لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔ میں ہاؤس کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ اشخاص اکثر میرے خوابوں میں آکر مجھے ڈراتے رہتے ہیں۔ پرسوں رات تو مجھے اتنا ڈر لگا کہ مارفیا کے ڈبل انجکشن کے باوجود نیند نہیں آئی۔ میں ہاؤس سے پوچھتا ہوں۔ ان لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ ہماری نیندیں حرام کردیں۔ کبھی فلک شگاف نعرے لگاکر۔ کبھی لال لال جھنڈے دکھاکر۔ کبھی ہمارے فریب کی قلعی کھول کر۔ کبھی ہماری جہالت پر طنز کرکے کبھی ہماری بیہودگیوں کا مذاق اڑاکر۔ میں سچ کہتا ہوں۔ ان لوگوں نے ہمارے اعصاب کا جو حال کررکھا ہے وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ تو مسٹر سپیکر! آپ کی اجازت سے میں ہاؤس کو بتانا چاہتا ہوں کہ جب تک ایسے لوگ جیل کی کوٹھڑیوں میں بند نہیں کئے جائیں گے۔ کم ازکم میں آرام سے نہیں سوسکونگا۔ حضرات کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ آپ کا محبوب لیڈر ساری ساری رات ڈر کے مارے سو نہ سکے۔ اور یہ لوگ اسے ڈراڈراکر ادھموا کردیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہاؤس میں کوئی سنگدل انسان نہیں جو یہ چاہتا ہو۔

مسٹر سپیکر! آخر میں صرف اتنا عرض کرنا باقی ہے کہ ہم نے جو نیا آئین بنایا تھا۔ وہ بالکل لغو اور فضول تھا۔ ہاؤس کو یاد ہوگا کہ اس آئین

رہیں ہم نے ہر شخص کی آزادی تقریر و تحریر کا حق دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری غلطی تھی۔ ہم اس کے لئے نادم ہیں۔ ہم نہایت عاجزی سے مرحوم باپو کی رُوح سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس غلطی کے لئے معاف کر دیں۔ اگر وہ نہ بھی معاف کریں تو چنداں مضائقہ نہیں کیونکہ مرحوم اب وہاں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں سے وہ صرف ہماری حرکتوں پر "لاحول" پڑھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔

خاموش نغمے!

یوں تو مدت سے سُن رکھا تھا کہ خاموشی معنے دارد کہ در گفتن نمے آید۔ لیکن اس مثل کی صداقت کا علم کچھ اس دن ہُوا۔ جب ایک دوست ہندوستانی ڈانسر کا ناچ دیکھنے گئے۔ ہم نے سمجھا تھا کہ "ہو جانے والے بالموا" قسم کا کوئی فلمی ناچ ہوگا۔ لیکن ہال میں پہنچ کر معلوم ہُوا۔ کہ یہ خالص استادی ناچ ہے۔ ڈانسر صاحب ایسا عجیب و غریب حلیہ بنا کر سٹیج پر تشریف لائے کہ ایک دفعہ تو دیکھ کر بھونچکا سا رہ گئے۔ ان کے ساتھ شاید ان کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ اب جو دونوں نے سٹیج پر اُچھلنا کودنا شروع کیا۔ تو پہلے تو ہم یہی سمجھے۔ کہ شاید ناچ شروع کرنے سے پہلے ورزش کر رہے ہیں۔ جب ہاتھ پاؤں کھُل جائیں گے تو ناچ شروع کرینگے۔ لیکن جب انہوں نے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر یہ عمل پندرہ بیس منٹ

جاری رکھا۔ تو ہم بہت گھبرائے۔ وہ انگلیوں اور آنکھوں سے ایسے ایسے عجیب اشارے کر رہے تھے۔ کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ کیا کہہ رہے ہیں یا کہنا چاہتے ہیں۔ ادھر ڈانسر صاحب نے آنکھ مٹکائی اور ادھر ان کی اہلیہ محترمہ کچے تاگے میں بندھی آئی گی سرکار مری کی مجسم تصویر بنی ان کے پاس پہنچ گئیں۔ وہ عجیب و غریب زاویہ بناتے ہوئے ابرو کو جنبش میں لائے اور وہ جھٹ چھلانگ لگا کر ان سے علیحدہ ہو گئیں۔ دونوں اپنی انگلیاں کچھ اس انداز سے توڑ مروڑ اور گھما رہے تھے کہ ہر لمحہ ڈر لگتا تھا کہ کہیں انہیں موچ آ گئی۔ تو پھر کیا ہوگا۔ اس ناچ کا کلائمیکس (CLIMAX) کچھ اس طرح ہوا۔ ایک دم ڈانسر صاحب زور سے سٹیج پر اچھلے اور اگر سٹیج واقعی مضبوط نہ ہوتی تو ضرور زمین پر آ رہتے۔ ادھر ان کی اہلیہ محترمہ ان کی جانب شعلے کی طرح لپکیں۔ ڈانسر صاحب نے انہیں گود میں لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ پینترا بدل کر صاف انہیں چکمہ دے گئیں اور سٹیج کی دوسری جانب پہنچ گئیں۔ حاضرین ڈانسر صاحب سے ہمدردی جتانے کی بجائے تالیاں پیٹنے لگے۔ ہم دل ہی دل میں حیران ہونے لگے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

ڈانس کے اختتام پر ہمارے دوست نے ہمیں بتایا کہ یہ "کتھا کلی" تھا۔ اس وقت تو ہم اسے انارکلی کی خالہ زاد بہن سمجھے۔ لیکن گھر لوٹتے وقت راستے میں ہمارے رفیق نے کتھا کلی کی تشریح فرماتے ہوئے بتایا کہ بیشتر استادی ناچ خاموشی کی زبان سے ادا کئے جاتے ہیں"۔ خاموشی کی

بھی زبان ہوتی ہے کیا؟" ہم نے حیران ہوکر پوچھا۔
"کیوں نہیں"۔ انھوں نے مسکرا کر جواب دیا "وہ سنا نہیں آپ نے جان کیٹس کا مشہور قول "خاموش نغمے عام نغموں سے شیریں ہوتے ہیں"۔

اُس دن سے ہم خاموشی کی گفتگو کے قائل ہو گئے۔ شاید اتنی جلدی نہ بھی ہوتے۔ اگر ایک اور واقعہ پیش نہ آتا۔ ایک صاحب کہ کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت تھے۔ مگر سلسلہ تعلیم منقطع کر کے یوگی ہو گئے تھے۔ مدت کے بعد ہمارے ہاں تشریف لائے۔ ایک دن ہم انہیں سیر کے لئے لے گئے۔ چلتے چلتے ایک صحرا میں جا نکلے۔ شام کا وقت تھا اور ہُو کا عالم۔ نہ جانے یوگی صاحب کے جی میں کیا آئی۔ کہ اچھل کر ایک ٹیلے پر جا بیٹھے۔ اور آنکھیں بند کر کے سمادھی کے عالم میں جا پہنچے۔ ادھر ہم انتظار کرنے لگے۔ کہ کب آنکھیں کھولتے ہیں۔ اور گھر چلتے ہیں۔ ادھر وہ اس طرح ڈٹ کر بیٹھے ہوئے تھے جیسے اب باقی عمر اسی ٹیلے پر بسر کریں گے۔ خدا خدا کر کے کوئی پون گھنٹے کے بعد انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ ہونٹوں پر ایک صوفیانہ قسم کی مسکراہٹ لاتے ہوئے فرمایا "آہا! خوب آنند آیا آج تو"۔ میں نے پوچھا "آپ کا مطلب ہے ٹیلے پر بیٹھ کر" فرمانے لگے "نہیں"۔

"تو پھر"
"خاموشی کا دلکش نغمہ سن کر"

"خاموشی کا نغمہ؟ ہمیں تو بالکل سنائی نہیں دیا۔"

"سنائی کیسے دیتا۔ وہ تو صرف روح کی گہرائیوں میں گونجتا ہے۔ اُسے سننے کے لئے روحانی کانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

یوگی صاحب کی بات کا ہم پر کافی اثر ہوا۔ اور ہم خاموشی کو سننے کی باقاعدہ مشق کرنے لگے۔ تھوڑی سی مشق کے بعد محسوس ہونے لگا۔ کہ یوگی صاحب بجا فرماتے تھے۔ خاموشی "ہے" کہ ایسی خاموشی جس کا ذکر کسی ستم ظریف نے حفیظ جالندھری کی نظم "چاندنی سیر" پر پیروڈی لکھتے ہوئے ان الفاظ میں کیا ہے:-

اِک براہمن خموش
پاس اُس کی زن خموش
گن رہے تھے دھن خموش
لڑکے لڑکیاں خموش
مٹکے مٹکیاں خموش
میں یہ شان کردگار
دیکھتا چلا گیا

ایسی خاموشی بھی کچھ نہ کچھ کہتے سنائی دیتی ہے۔ آپ شاید کہیں گے ہم مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔ بالکل نہیں۔ اگر خاموشی باتیں نہ کر سکتی۔ تو فانی بدایونی اتنے وثوق سے اپنی وفات حسرت آیات کے بعد اپنی محبوبہ سے نہ کہتے سے

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!

خیال فرمائیے۔ شاعر کفن میں لپٹا ہوا پڑا ہے۔ محبوبہ اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ بظاہر دونوں خاموش ہیں۔ لیکن ان دونوں کی خاموشی کیا کچھ نہیں کہہ رہی۔ بقول یوگی صاحب ذرا اپنے روحانی کانوں سے سننے کی کوشش کیجئے۔ شاعر کی خاموشی پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ "لیجئے صاحب۔ آپ ہم سے ہمیشہ خفا رہے۔ کہ ہم آپ کی جفاؤں کا ذکر کر کے آپ کو شرمندہ کیا کرتے تھے۔"

"آج ہم بالکل خاموش ہو گئے۔ کہیئے اب تو آپ خوش ہیں"۔ اور محبوبہ کی خاموشی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتی ہے۔ "افسوس! آپ بہت جلد باز نکلے۔ ہم نے مانا کہ آپ کے شکووں سے کافی تنگ آ گئے تھے کہ ان میں بیشتر بے معنی ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ آپ خودکشی کر لیں اور ہمیں اس لطف سے محروم کر دیں۔ جو گاہے گاہے آپ کے شکوے سن کر آتا تھا۔"

خیر یہ تو بہت سنجیدہ خاموشی تھی۔ جس کی گفتگو سننے کی شاید آپ تاب نہ لا سکے ہوں۔ آئیے! آپ کو ایک ایسی خاموشی کی گفتگو سنائیں۔ جس کے ساتھ شاید آپ کا بھی واسطہ پڑا ہو۔

بابو صاحب خلاف معمول گھر نہیں لوٹے۔ شریمتی جی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی ہیں۔ دس۔ ساڑھے دس۔ گیارہ۔ بارہ۔ ساڑھے بارہ بجے

بابو صاحب تشریف لائے شریمتی جی کا چہرہ دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ "تن کے بیٹھے ہیں"۔ باریک سی آواز میں کھانا طلب کیا۔ انہوں نے بڑی بے رخی سے پیش کیا۔ بابو جی نے ایک آدھ بار سوچا کہ سالن کی تعریف کر کے شریمتی جی کے پارے کو نیچے لے آئیں۔ پھر سوچا۔ یہ سستا ہتھیار بے سود ثابت ہوگا۔ چپ رہے۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں بیٹھنے کے کمرے میں آگئے۔ شریمتی جی سوئیٹر بُننے لگیں۔ بابو صاحب اخبار پڑھنے لگے۔ لیکن نہ اُن کا دل سوئیٹر بننے میں لگ رہا ہے۔ نہ اِن کا اخبار میں۔ دونوں خاموش ہیں۔ لیکن دراصل دونوں کچھ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔

بابو صاحب۔ ذرا ذرا سی بات پر شک کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ ٹھیک ہے میں مس لیلا کے ہی گھر سے آ رہا ہوں۔ لیکن اُس کے گھر جانا جرم ہے نہ گناہ۔ آخر ہُوا کیا جو میں دیر سے لوٹا۔ لیکن جب دلچسپ باتیں ہو رہی ہوں۔ وقت کا کسے خیال رہ سکتا ہے۔ بس آپ اس پر تلملا رہی ہیں؟

شریمتی جی۔ "میں آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں مس لیلا خوبصورت ہے۔ آپ اسے اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ دلچسپ جھوٹ بول سکتی ہے۔ جب سے اُس نے آپ کی تحریروں میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے آپ اس کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر وہ آپ کو اس قدر پسند ہے۔ تو آپ نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی۔"

بابو صاحب کی خاموشی جواب الجواب عرض کرتی ہے "عجیب مصیبت

ہے یہ شادی بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیوی کے علاوہ کسی سے بات تک نہ کرو۔ مس لیلا کچھ بھی ہو۔ ذہین لڑکی ہے۔ جب میں اسے اشعار سناتا ہوں۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ آپ کی طرح یہ نہیں کہتی۔ شعر تو ہوتے رہیں گے۔ پہلے بازار جا کر بینگن لے آئیے۔"

آئیے اب ذرا آپ کو شہر کے سب سے بڑے باغ میں لے چلیں۔ وہ دیکھئے ایک بینچ پر ایک نوجوان چپ چاپ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ اداس۔ رنگ زرد اور چشم پُرنم ہے۔ پتھر کے بُت کی طرح وہ ساکن اور خاموش ہے۔ شاید وہ ناکام عاشق ہے۔ فیل شدہ طالب علم ہے۔ یا مظلوم خاوند ہے۔ بھلا سنیئے تو اس کی خاموشی کیا کہہ رہی ہے۔ آپ نہیں سُن سکتے۔ تھوڑی سی اور کوشش کیجئے۔ سنا آپ نے؟ اس کی خاموشی بار بار صرف ایک شعر گنگنا رہی ہے۔

تخلیق کائنات کے دلچسپ جُرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی نیرواں کبھی کبھی!

لیجئے آپ کے دیکھتے دیکھتے وہ نوجوان ایک ادھیڑ عمر کے آدمی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے چہرے پر متعدد جھریاں اُبھر آئی ہیں۔ بال اچانک کھچڑی ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ بدستور خاموش ہے۔ اب وہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتا ہے "عجیب تقاضے ہیں ہونے والے دامادوں کے۔ پندرہ ہزار جہیز میں۔ میرے پرماتما! پندرہ ہزار کوئی کہاں سے لائے۔ کیا بھلے تھے وہ دن جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ نہ غیر معقول جہیز کا مطالبہ نہ کوئی

اور بدعت۔ پندرہ ہزار کا انتظام کیسے ہوگا۔ قرض؟ ڈاکہ؟ امانت میں خیانت؟ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ نہیں آتی۔ نہیں آتی!"

اور اگر آپ غور سے دیکھیں تو شام کے دھندلکے میں یہ اُدھیڑ عُمر کا آدمی بہت ضعیف نظر آنے لگا ہے۔ شاید وہ سال خوردہ لیڈر ہے۔ جو گم سم بیٹھا ماضی کی راکھ میں سے چنگاریاں چُن رہا ہے۔ کبھی وہ خاموش فلسفی نظر آتا ہے۔ جو حیات و ممات کے جھگڑے چکا رہا ہے۔ کبھی وہ خاموش شاعر ہے۔ جو خالقِ کون و مکان سے اُلجھ رہا ہے۔ کبھی وہ مایوس قنوطی ہے۔ جسے ہر مسکراہٹ پر آنسو اور ہر بہار پر خزاں کا گمان ہوتا ہے۔ اور کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاموش مفکر ہے۔ جو بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے والوں سے کہتا ہے ؎

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اُتنا ہی وہ خاموش ہے

حماقت

جب کالج میں پڑھتے تھے اور دوستوں اور رشتہ داروں کی ازدواجی زندگی کو قریب سے دیکھتے تھے تو سوچا کرتے تھے کہ زندگی میں بڑی سے بڑی حماقت کرینگے لیکن شادی نہیں کرینگے۔ یہ خیال اور بھی مستحکم ہو جاتا۔ جب آئے دن بڑے بھائی صاحب اور بھاوج میں نوک جھونک سننے کا موقعہ ملتا۔ آج بھاوج اس لئے ناراض ہیں کہ بھائی صاحب پانچ بجے کی بجائے سات بجے دفتر سے واپس آئے۔ آج اس لئے بگڑ رہی ہیں کہ وہ اکیلے سینما دیکھنے کیوں گئے تھے۔ اور کبھی اس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ کہ وہ عورتوں کو مردوں کی بہ نسبت بیوقوف سمجھتے ہیں۔

جب کبھی بھاوج اپنی سہیلیوں کے ساتھ کسی جلسے میں شرکت کرنے جاتیں اور منے کو سنبھالنے کا فرض بھائی صاحب کے ذمہ ہوتا۔ اس وقت

ان کی حالت نہایت قابل رحم ہوتی ۔ منّا ہے کہ بے تحاشا چلائے جا رہا ہے ۔ وہ اُسے چپ کرانے کے لئے لاکھ جتن کر رہے ہیں ۔ مگر منّا کمبخت ماننا ہی نہیں "منّے وہ دیکھو ۔ وہ طوطا ۔ کتنا اچھا طوطا ہے ہے نا منّے ؟ دیکھو اس کی چونچ کتنی اچھی ہے ...... اچھا بابا اچھا ۔ طوطا پسند نہیں ۔ وہ چڑیا دیکھو کتنی خوبصورت ہے ۔ چوں چوں کرتی ہے ۔ کرتی ہے نا ؟ کتنی اچھی چڑیا ہے ۔ چھوٹی سی ۔ چوں چوں کرتی ہے ۔ چوں ۔ چوں ۔ چوں ! دیکھو منّے دیکھو !"

لیکن منّا نہ طوطے کی طرف دیکھتا نہ چڑیا کی طرف بلکہ منہ بنائے لگاتار روئے چلا جاتا ۔ حتےٰ کہ بھائی صاحب کو غصہ آ جاتا اور وہ چیخ کر کہتے ۔ "چپ بھی کر شیطان ۔ کرتا ہے یا نہیں ؟ لگا دوں ایک تھپڑ !" تھپڑ کا نام سنتے ہی منّا اَنّے زور سے رونے لگتا ۔ جیسے بیک وقت اسے کئی بچھوؤں نے کاٹ کھایا ہو ۔ ایسا اور اس قسم کے مناظر دیکھ کر ہم دعا مانگا کرتے تھے کہ خدا شادی سے ہر شخص کو محفوظ رکھے ۔

ایم اے کرنے کے بعد کالج میں ملازمت مل گئی تھی ۔ کوچہ بلی ماراں کے نکڑ پر ایک چھوٹا سا کمرہ کرایے پر لے رکھا تھا ۔ جس میں ایک معمولی درجے کا صوفہ تھا ۔ دو تین کرسیاں ، چند دلچسپ کتابیں ۔ ایک پالتو کتا ۔ اور ایک وائلن ۔ پڑھتے پڑھتے اکتا گئے ۔ تو کتے سے کھیلنے لگے کتے کی شرارتوں سے تنگ آ گئے ۔ تو وائلن بجانا شروع کر دیا ۔ کھانا ایک متوسط درجے کے ہوٹل سے کھاتے تھے ۔ اور ہر چند کہ کھانا اس قسم کا

ہوتا تھا کہ بسا اوقات محسوس ہوا جیسے ہم کھانے کو نہیں۔ کھانا ہمیں کھائے جا رہا ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر بجا لاتے تھے کہ اس کھانے سے بہتر ہے جو ہزاروں بیویاں اپنے خاوندوں کو آئے دن کھلاتی ہیں۔

بڑے آرام سے زندگی گذر رہی تھی۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چرخ کج رفتار کسی کو چین سے نہیں رہنے دیتا۔ وہی معاملہ ہوا۔ ہمارے خاندان میں ایک بزرگ تھے۔ جنہیں ہر کنوارے آدمی سے چڑ تھی۔ ان کا تکیہ کلام تھا "اکیلے آدمی کی بھی کیا زندگی ہے"۔ عقیدہ ان کا یہ تھا۔ کہ اگر انسان دو تین شادیاں نہ کر سکے۔ تو کم از کم ایک تو ضرور کرے۔ یہ بزرگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ وقت بے وقت انہوں نے ہمیں یہ ذہن نشین کرانا شروع کر دیا۔ کہ شادی نہ کر کے ہم ایک گناہ عظیم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ جب کبھی ملتے کسی فلسفی یا ماہر کا حوالہ دے کر فرماتے "حکیم چن چیان چون نے لکھا ہے کہ جو شخص شادی نہیں کرتا وہ فرشتہ ہے یا پاگل۔ امریکہ کے ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ وہ شخص زندگی میں کبھی باپ نہیں کہلا سکتا۔ جس نے شادی نہیں کی"!

ہم متانت سے عرض کرتے کہ بہر حال ہمارا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ کیونکہ ہم شادی کو اچھی خاصی مصیبت سمجھتے ہیں۔ ہفتہ عشرہ کے بعد بزرگ سے پھر ملاقات ہوتی۔ اور وہ چھوٹتے ہی پھر شادی کا ذکر چھیڑ دیتے "میرے ایک دوست ریٹائرڈ مجسٹریٹ ہیں۔ اُن کی

صاحبزادی ایم۔اے ہیں۔ نہایت شریف لڑکی ہے۔ رنگ ذرا سانولا ہے لیکن جہیز معقول ملے گا۔"

میرے ایک دوست کے دوست ٹھیکیدار ہیں۔ ان کی بھتیجی بی اے بی ٹی ہیں۔ گورنمنٹ سکول میں پڑھاتی ہیں۔ گانا جانتی ہیں۔ لیکن ناچنا نہیں۔ پاؤں میں نقص ہے۔ جہیز میں کم از کم بیس ہزار"۔ ہم ان کی بات کاٹ کر کہتے۔ "ہمیں بیوی کی ضرورت ہے نہ جہیز کی۔ آپ کسی اور سے بات کر لیجئے۔" بزرگ برابر فرماتے جاتے "۔ آپ کو دونوں کی ضرورت ہے۔ لیکن خدا جانے آپ کی عقل پر کیوں پردہ پڑ گیا ہے۔ کہ آپ ایک کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔"

ایک دن ہم بیمار پڑ گئے۔ بزرگ تیمارداری کو آئے۔ اس دن انہوں نے "شادی کی ضرورت" پر کچھ اتنے موثر انداز میں لیکچر دیا کہ ہمیں ان پر ایمان لانا ہی پڑا۔ کہنے لگے "دیکھا۔ یہ حال ہوتا ہے غیر شادی شدہ کا۔ درد سے کراہ رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ خدانخواستہ اگر یونہی لیٹے لیٹے آپ پر نزع کی حالت طاری ہو جائے۔ ہمارا مطلب ہے اگر یک لخت دل کی حرکت بند ہو جائے۔ تو آپ وصیت بھی نہ کر سکیں گے۔ بیوی پاس ہوتی۔ کم از کم آپ کی وصیت تو لکھ لیتی۔ سچ کہا ہے حکیم فلِ فلِ دراز نے "اکیلے آدمی کی بھی کیا زندگی ہے"۔ ذرا اپنے کمرے کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ کتابیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی ہیں۔ تکیے کا غلاف حد سے زیادہ میلا ہے۔ کرسیاں گرد سے اٹی پڑی ہیں۔

فرش کا بُرا حال ہے۔ بیوی ہوتی تو بخدا اس گھر کا نقشہ ہی دُوسرا ہوتا۔"

دو ہفتے بیمار رہنے کے بعد جب تندرست ہوئے۔ تو ہم واقعی محسوس کرنے لگے کہ اکیلے آدمی کی زندگی کوئی زندگی نہیں۔ چنانچہ اب جو بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ اور انہوں نے حسب معمول کہا "میرے ایک دوست ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ان کی لڑکی الیف۔ اے فیل ہے۔ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ قد ذرا ......"

تو ہم نے فوراً کہا۔ "قطع کلام معاف! ہمیں منظور ہے۔" بزرگ نے کرسی میں اچھلتے ہوئے فرمایا۔ "بخدا زندگی میں پہلی بار تم نے عقل سے کام لیا ہے۔"

شادی ہوگئی اور گھر کا نقشہ بدلا جانے لگا۔ پرانے صوفے کی جگہ جہیز میں آئے ہوئے نئے صوفے لے لی۔ ٹوٹی ہوئی کرسیاں نیلام گھر بھجوا دی گئیں۔ آتشدان پر پہلی بار گلدستے رکھے گئے۔ ردی کے ڈھیر باہر پھینکوائے گئے۔ فرش کو مل مل کر دھویا گیا۔ غرضیکہ در و دیوار کی صورت بدل ڈالی گئی۔ اس نئے ماحول میں مسرت اور سکون کا ملا جلا ایسا دلکش احساس تھا۔ کہ ہمیں اپنے پر رشک آنے لگا۔ شروع شروع میں شریمتی جی اس سلیقے اور شرافت سے پیش آئیں کہ آدرش ہندو بیویوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ اگر نہانے کے لئے پانی طلب کیا تو فوراً گرم پانی مہیا کیا گیا۔ اگر صرف چائے کا مطالبہ کیا تو چائے اور ٹوسٹ حاضر کئے گئے۔ اگر پاؤں دبانے کو کہا۔ تو وہ پاؤں کے ساتھ سر بھی دبانے لگیں۔ مگر جوں جوں وقت گذرتا

گیا۔ معلوم ہوا کہ شریمتی جی وہ نہیں ہیں جو نظر آتی ہیں۔ تین چار ماہ کے بعد محسوس ہوا کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے

نیا دَور ہے ساز بدلے گئے

شریمتی جی بات بات پر بیخ پا ہونے لگیں۔ ایک دن صبح کے وقت ہم وائلن بجا رہے تھے کہ انہوں نے ساتھ والے کمرے سے چلا کر کہا۔ "بند بھی کیجئے۔ یہ ٹروں ٹروں سنتے سنتے کان بھی پک گئے۔" ہم نے عرض کیا "یہ ٹروں ٹروں نہیں۔ بھیرویں کا الاپ ہو رہا ہے۔" وہ ہمارے قریب آکر بولیں "ہوگا بھیرویں کا الاپ۔ لیکن اسے ختم کیجئے۔ مجھے اس شور و غل سے وحشت ہونے لگتی ہے۔"

دو ایک دن کے بعد ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ شریمتی جی کہنے لگیں "آپ کے اس نگوڑے کتے نے ہماری بلی کا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ ایک منٹ چین نہیں لینے دیتا۔ اسے یا تو خود کہیں چھوڑ آیئے ورنہ میں اسے گھر سے نکال دونگی۔" ہم نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "شریمتی جی ہم نے مانا کہ آپ کو اپنی بلی بہت عزیز ہے کہ آپ اُسے میکے سے ساتھ لائی تھیں۔ لیکن یہ بھی سوچئے کہ ہمارا کتا بھی ہمیں کم عزیز نہیں۔ یہ ہمارا اس زمانے کا ساتھی ہے۔ جب ہم بالکل بے یار و مددگار تھے۔"

"ہوگا آپ کا ساتھی"۔ انہوں نے چمک کر کہا "لیکن اس کا یہ مطلب

نہیں کہ وہ ہماری بلی پر ناجائز رعب جماتا پھرے"۔

ہم نے شرارتاً عرض کیا "آپ ہم پر رعب جماتی ہیں۔ اگر ہمارے کُتّے نے آپ کی بلی پر رعب جمالیا۔ تو کیا مضائقہ ہے"؟

انہوں نے مزاح کے پہلو کو نظر انداز فرماتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے اس کی حرکتیں سخت ناپسند ہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ اُسے کہیں چھوڑ آیئے"۔

ایک عجیب بات جو شریمتی جی میں دیکھی یہ تھی۔ کہ انہیں ہر چیز سے نفرت تھی۔ جو ہمیں پسند تھی۔ اگر ہمیں مطالعہ مرغوب تھا۔ تو انہیں کشیدہ کاری۔ اگر ہمیں ٹماٹر پسند تھے تو انہیں کریلے۔ ہم شیکسپیئر پر جان دیتے تھے تو وہ کالی داس پر۔ حساب لگا کر دیکھا کہ جو چیز ہمیں پسند ہے۔ وہ شریمتی جی کو بالکل پسند نہیں۔ خاص طور پر شریمتی جی کو ہمارے "مضامین" سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ گھنٹوں کی مغز پچی کے بعد جب ہم ایک اچھا مضمون لکھتے اور داد طلب نگاہوں سے اُن سے سننے کی فرمائش کرتے۔ تو وہ ناک بھوں چڑھا کر کہتیں "مضمون بعد میں سُنا لیجئے گا۔ پہلے ہماری بلی کو کسی اچھے ویٹرنری ڈاکٹر سے دکھا لائیے۔ بیچاری کو پرسوں سے زوروں کی کھانسی ہو رہی ہے"۔ ان حالات میں ہم خاک مضمون سناتے دانت پیس کر رہ جاتے۔

خیر یہ سب تو زمانہ ماضی کی باتیں ہیں۔ اب جبکہ ہماری شادی کو بیس برس ہو گئے ہیں اور ہم نہ صرف ایک بیوی کے خاوند بلکہ نصف

در جن بچوں کے والد بزرگوار بھی ہیں ۔ حالت اور بھی دگر گوں ہے ۔ ہم نے سمجھا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد شریمتی جی کے مزاج میں سنجیدگی آ جائیگی ۔ لیکن معلوم ہؤا ۔ کہ یہ محض ہمارا وہم تھا ۔ ان دنوں یہ کیفیت ہے کہ شاید ہی کوئی دن ہوتا ہوگا ۔ جب ایک آدھ جھڑپ نہیں ہوتی ۔ اور کئی بار تو ایک ہی دن میں کئی جھڑپیں ہو جاتی ہیں ۔

ہم تھکے ماندے شام کے چار بجے کالج سے واپس آئے ۔ شریمتی جی ایک جاسوسی ناول پڑھ رہی ہیں ۔ ہم نے بڑی مدھم آواز میں کہا ۔ " بہت پڑھ لیا ۔ اب اُٹھیے ۔ چائے کا انتظام کیجئے ۔ " انہوں نے سُنی ان سُنی کرتے ہوئے ناول کا مطالعہ جاری رکھا ۔ ایک آدھ منٹ کے بعد ہم نے پھر کہا " چھوڑیئے بھی اب اِسے پھر کسی وقت پڑھ لیجئے گا ۔ اس بار انہوں نے خشم آلود نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ۔ " واہ ! آپ بھی کمال کرتے ہیں ۔ ابھی ابھی تو کہانی کا لطف آنے لگا ہے ۔ چھوڑ کیسے دُوں ؟ "

" خاک لطف آنے لگا ہے ۔ ہونا ہی کیا ہے ان ناولوں میں " ۔

" واہ ! ہوتا کیوں نہیں ۔ ڈاکو پانچواں قتل کر کے بھاگ گیا ہے ۔ پولیس جیپ میں بیٹھ کر تعاقب کر رہی ہے ۔ سارے شہر میں کہرام مچا ہؤا ہے ۔ بیچارہ سراغرساں پریشان ہے ، اور آپ کہتے ہیں کچھ ہو ہی نہیں رہا ؟ "

چند منٹ بعد ہم نے پھر ان کی توجہ چائے کی طرف دلائی ۔ وہ

بدستور ناول پڑھتی رہیں۔ آخر تنگ آکر ہم نے کہا "خود غرضی کی حد ہوگئی۔ یہاں چائے بغیر دم نکلا جا رہا ہے۔ لیکن ہے کسی کو خیال"۔

"جی ہاں۔ اور آپ کم خود غرض ہیں نا!" انہوں نے طنز کا بھرپور وار کرتے ہوئے فرمایا "یاد ہے پرسوں کہا تھا۔ سینما لے چلیئے اور ٹکا سا جواب دیا تھا۔ مجھے مس نلنی کی پارٹی میں جانا ہے"۔

"لیکن ہم مس نلنی کی پارٹی سے کیسے غیر حاضر ہو سکتے تھے"۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر جائیے نا مس نلنی کے ہاں۔ آج بھی اُسی سے چائے پی لیجیے"۔

چائے کی بجائے ہم لہو کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

کسی رات ذرا دیر سے گھر لوٹے۔ انہوں نے بچوں کی موجودگی میں ہی ہمارا "کورٹ مارشل" شروع کر دیا۔

"شکر ہے آپ کو گھر کی بھی یاد آئی۔ ذرا دیر سے آنا تھا۔ ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں"۔

ہم نے اپنی صفائی میں ایک آدھ معقول عذر پیش کیا۔ انہوں نے اس کی بالکل پروا نہ کرتے ہوئے کہا "جی ہاں۔ گھر جائے جہنم میں۔ آپ کو آئے دن جلسوں اور کانفرنسوں سے کام۔ کوئی نہ بھی مدعو کرے جائیں گے ضرور۔ وقت جو برباد کرنا ہوا"۔

"دیکھیے آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ مجھے اس جلسے کی صدارت کرنا تھا"۔

"جی ہاں - آپ کے علاوہ بھلا انہیں اور کوئی صدر کہاں ملے گا۔
آپ قابل ترین آدمی جو ٹھہرے"۔
"قابل ہوں یا نا اہل - جب کوئی مدعو کرے - جانا ہی پڑتا ہے"۔
"تو کون کہتا ہے - نہ جائیے - آپ کو ڈر کس کا ہے"؟
"ڈر نہ ہوتا - تو واپس کیوں آتے"۔
بڑا احسان کیا ہے - پھر چلے جائیے کسی اور جلسے کی کرسیِ صدارت
انتظار کر رہی ہوگی"۔
"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہیں"۔
"جی ہاں - یہ میری پرانی عادت ہے"۔
"یہ میں نے کب کہا - میرا مطلب ہے آپ کی طبیعت . . . ."
"جی ہاں - میری طبیعت بہت بری ہے - قسمت اس سے بھی
بری ہے"۔
"آپ پھر قسمت کا رونا لے بیٹھیں - آخر ہو کیا گیا"؟
"کچھ بھی نہیں ہوا - میں تو یونہی پاگل ہوں"۔
"میں نے آپ کو پاگل تو نہیں کہا"۔
"نہیں کہا - تو اب کہہ لیجئے - یہ حسرت بھی کیوں رہ جائے"۔
نتیجہ اِس بحث کا یہ ہوا - کہ انہوں نے بڑی بے دلی سے کھانا
پیش کیا - ہم نے دو چار لقمے زہر مار کئے - اور چپ چاپ سونے کے کمرے
میں چلے گئے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیر و تفریح سے گھر لوٹے اور عجیب نظارے دیکھنے کو ملے۔ بڑے لڑکے نے چھوٹے کو بڑی بے رحمی سے پیٹا ہے۔ وہ ڈھاریں مار مار کر رو رہا ہے۔ چھوٹی منی کو بخار ہے۔ وہ درد سے کراہ رہی ہے۔ سب سے چھوٹا منا دودھ کے لئے چلا رہا ہے۔ شریمتی جی غیض و غضب کی حالت میں اپنا غصہ کبھی ایک اور کبھی دوسرے بچے پر اتار رہی ہیں۔ اور ساتھ ایسی بد دعائیں دے رہی ہیں۔ کہ اگر وہ قبول ہو جائیں۔ تو گھر میں ان کے علاوہ کوئی زندہ نہ رہے۔ یہ نظارے دیکھ کر جی میں آتا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ اور ایک دفعہ پھر کوچہ بلّی ماراں کے نکڑ والے مکان میں جا بسیں۔ جہاں اپنے سوا کوئی نہ ہو۔ بس ایک معمولی سا صوفا ہو۔ دو تین کرسیاں۔ چند دلچسپ کتابیں۔ ایک کتا۔ اور ایک وائلن۔ پڑھتے پڑھتے اکتا جائیں تو کتے سے کھیلنے لگیں۔ اور کتے کی شرارتوں سے تنگ آ جائیں تو وائلن بجانا شروع کر دیں۔

خط کا جواب

ہر ایک بڑے آدمی میں ایک نہ ایک وصف ضرور ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی بکری کا دودھ۔ اقبال حقہ اور ڈاکٹر جانسن قہوہ پیتے تھے۔ مجھ میں یہ وصف ہے کہ میں کسی بھی شریف آدمی کے خط کا جواب نہیں دیتا یعنی خط کا جواب پی جاتا ہوں۔ آپ کہیں گے وصف کی بلی ایک کہی۔ یہ تو اچھی خاصی بد دماغی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں اور غالباً آپ کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ بڑے آدمیوں کی بد دماغیوں کا شمار اکثر اوصاف میں کیا جاتا ہے اور پھر یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ کوئی بڑا آدمی کسی چھوٹے آدمی کے خط کا جواب نہیں دیتا۔ آپ کو یقین نہ آئے تو کسی بڑے آدمی کو خط لکھ کر دیکھ لیجئے۔ آپ حشر تک انتظار کیجئے۔ جواب نہیں آئیگا۔ مجھے یاد ہے (یہ اس وقت کی بات ہے جب میں خود بڑا آدمی نہیں تھا) میں

نے ہٹلر کو ایک خط لکھا ۔ مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

براورم ہٹلر !

القاب سے خفا نہ ہو جیئے ۔ براورم اس لئے لکھا کہ خاکسار بھی آپ کی طرح آرین ہے ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں ۔ میرا مطلب ہے ۔ ہر رات لندن پر کیوں بمباری کی جا رہی ہے ۔ انگریز لاکھ دشمن سہی لیکن اتنے بُرے نہیں کہ ان کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے ۔ آخر وہ بھی آرین ہیں ۔ یہودی ہوتے تو شاید چنداں مضائقہ نہیں تھا ۔ آخر میں صرف اتنا کہنا ہے کہ لندن پر مزید بمباری کرنے سے باز آیئے ۔ اور اس خط کا جواب دیجئے کہ دل کو تسلی ہو۔

اس خط کا کوئی جواب نہ آیا ۔

مشہور ہالی وُڈ ایکٹریس " گری ار گارسن " کو میں نے ایک دفعہ مندرجہ ذیل خط لکھا ۔

ڈیر گری ار گارسن !

جب سے آپ کو ایک فلم میں ہیرو سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے دل چاہتا ہے کہ آپ سے ملاقات کی جائے ۔ لیکن افسوس ہالی وڈ بہت دُور ہے اور خاکسار کے پاس ہوائی جہاز ہے نہ موٹر سائیکل ۔ صرف ایک ہی صُورت ہے ۔ اگر آپ ہوائی جہاز کا کرایہ اپنی پہلی فرصت میں بھجوا دیں ۔ تو آپ سے ملاقات کے علاوہ امریکہ کی سیر مفت میں ہو جائے ۔ خط کا جواب ضرور دیجئے گا ۔

اس خط کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔

آپ کہیں گے۔ یہ دونوں خطوط اس قابل ہی کب تھے کہ ان کا جواب دیا جاتا۔ میں کہونگا۔ بہت سے خطوط جو مجھے آتے ہیں وہ بھی اس قابل کب ہوتے ہیں کہ ان کا جواب دیا جائے۔ لیجئے آج کی ڈاک سے میں آپ کو تین خطوط پڑھ کر سناتا ہوں۔

(١)

مکرمی!

آپ کو یاد ہوگا کہ آج سے تین سال قبل آپ نے شاید بجلی کا بل ادا کرنے کے لئے مجھ سے پانچ روپے قرض لئے تھے کہ جو آپ نے آجتک ادا نہیں کئے۔ کیا میں امید کروں کہ آپ یہ رقم ادا کر کے ایک پرانے قرض سے سبکدوش ہونے کا خوش گوار فرض ادا کرینگے؟

(٢)

محترمی!

میں ایک گمنام ادیب ہوں۔ اس وقت تک ڈیڑھ سو کہانیاں لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے شائع ایک بھی نہیں ہوئی۔ میں اپنی کہانیوں کا مجموعہ چھپوانا چاہتا ہوں لیکن کوئی ناشر اسے چھاپنے کے لئے تیار نہیں اگر آپ دیباچہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو شاید کوئی ناشر اپنے سینے پر پتھر رکھ کر انہیں چھاپ ہی دے۔ میں اس اتوار کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ کھانا آپ کے ہاں ہی کھاؤنگا۔ امید ہے آپ دو ایک

گھنٹوں میں دیباچہ لکھ لیں گے اور میں چار بجے کی گاڑی سے گھر لوٹ سکونگا۔

(۳۲)

برادرم!

کل پتہ چلا کہ آپ ان دنوں موگا میں مقیم ہیں۔ آپ شاید میرے نام سے تو واقف نہ ہوں کام سے ضرور واقف ہونگے۔ میں پچھلے تین مہینوں سے ایک رسالہ نکال رہا ہوں۔ عام نمبر کوئی خاص کامیاب نہیں ہوئے۔ اس لئے ایک خاص نمبر نکالنے کا خیال ہے۔ کیا میں اُمید کروں کہ آپ اس کے لئے کوئی تازہ مضمون بھیج کر مجھے ممنون فرمائینگے۔ مضمون کے علاوہ اگر رسالہ کے دس پندرہ مستقل خریدار بنا سکیں تو شاید یہ رسالہ چل ہی نکلے۔

آپ خود ہی فیصلہ کیجئے۔ کہ ان خطوط کا کیا جواب دیا جائے۔ تبھی تو میں کہتا ہوں کہ بہت سے خطوط کا بہترین جواب "خاموشی" ہی ہے۔ کسی نے آپ کو خط لکھا اور اگر وہ مرزا غالب۔ جان کیٹس یا لارڈ بائرن نہیں ہے تو یقیناً اس نے نہایت اُوٹ پٹانگ باتیں لکھی ہونگیں۔ اس نے خط لکھنے کی حماقت کی۔ آپ اس کے خط کا جواب دے کر خواہ مخواہ بیوقوف کیوں بنیں اس لئے خط پڑھئے اور اس دُعا کے ساتھ کہ خدا لکھنے والے کو بہتر خط لکھنے کی توفیق دے۔ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیجئے۔ اگر شومیٔ قسمت سے اس شخص سے کبھی ملاقات ہو جائے اور نوبت شکوہ شکایت تک پہنچے تو نہایت سنجیدگی سے کہہ دیجئے۔ "برادرم! اوّل تو آپ نے مجھے خط لکھا ہی نہیں۔ اگر لکھا گیا تو پوسٹ نہیں کیا ہوگا۔ اگر پوسٹ کیا تو مجھے ملا نہیں۔ اگر مجھے

ملا۔ تو میں نے اس کا جواب ضرور دیا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کو نہ ملا ہو" اگر وہ یہ عذر قبول کرے تو بہتر ورنہ یوں کہیئے "ہو سکتا ہے آپ نے مجھے خط لکھا ہو لیکن مجھے نہیں ملا۔ اس میں نہ آپ کا قصور ہے نہ میرا۔ دراصل پچھلے تین مہینوں میں پانچ دفعہ مکان تبدیل کر چکا ہوں۔ پہلا مکان اس لئے چھوڑنا پڑا کہ اس میں چوہے بہت تھے۔ پلیگ پھوٹنے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ دوسرا اس لئے کہ ہمسایے شریف نہ تھے۔ ہر وقت پوچھتے رہتے تھے آپ دہلوی ہیں یا لکھنوی۔ تیسرا چوتھا اور پانچواں اس لئے کہ کرایہ ادا نہ کر سکا۔ الغرض عجیب پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ آپ نے خط ضرور لکھا ہوگا لیکن ڈاکیہ اسے کونسے گھر میں ڈال گیا۔ اس کا علم ڈاکیئے کے سوا کسی کو نہیں"۔

اگر وہ پھر بھی نہ مانے۔ تو آپ ایک مصنوعی قہقہے کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہیئے۔ "ارے بھئی! کیسی باتیں کرتے ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمہارا خط آئے اور میں جواب نہ دوں۔ واللہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ تمہارے خط کے جواب میں تین خط لکھوں۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھوں۔ جب تک کہ تم گھبرا کر مجھے خط لکھنا بند کر دو۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ تم خط لکھتے ہی نہیں"۔

ظاہر ہے کہ یہ حربے اکثر ناکام ثابت ہونگے۔ لیکن ان کی ناکامی کا فائدہ آپ کو ہوگا۔ آپ کا دوست سمجھ جائیگا کہ آپ خط کا جواب دینا نہیں چاہتے۔ اور آئندہ سوچ سمجھ کر خط لکھیئے گا۔

کیا محبوب کے خط کا جواب دینا چاہیئے یا نہیں؟ میری دانست میں بالکل نہیں۔ اوّل تو آپ کو آپ کے گھر والے ہمیشہ اس طرح گھیرے رہتے ہیں کہ محبوب کا خط تنہائی میں پڑھنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ اور اگر بالفرض سب کی آنکھ بچا کر آپ نے پڑھ لیا۔ تو پھر جواب دینے کے لئے جو یکسوئی اور فراغت درکار رہے۔ وہ ایک اوسط گھرانے میں کیسے میسّر ہو سکتی ہے۔ اور پھر سچ پوچھئے۔ تو جب سے ڈاک اور تار کے سلسلے معرض وجود میں آئے ہیں محبوب کو خط لکھنے کا سارا مزا ہی کرکرا ہو گیا۔ کیا بھلے دن تھے جب عشاق خط بھیجنے کے لئے کبوتر پالا کرتے تھے۔ سب سے پہلے کسی باغ سے بہکا یا پھسلا کر ایک اصیل سا کبوتر پکڑ لاتے۔ پھر اسے محبوب کے گھر کا راستہ سمجھاتے۔ بعد ازاں شعرا کے دواوین کا مطالعہ کرتے تاکہ اچھے اچھے اشعار ہاتھ لگ جائیں اور اس کے بعد کسی فرصت کے وقت خط لکھ کر اس پر نفیس سا عطر چھڑکتے اور کبوتر کے پَر کے ساتھ احتیاط سے باندھ کر کہتے "جانِ عاشق۔ لپک کے جائیو۔ اور کرارا سا جواب لے کر آئیو"۔ کبوتر خط لے کر اپنی کھوئی ہوئی کبوتری کی تلاش میں نکل جاتا۔ اور عاشق میاں انتظار کرتے کرتے پاگل ہو جاتے۔ اس انتظار میں جو مزا تھا۔ وہ کسی پرانے زمانے کے عاشق سے پوچھئے۔ اب نہ عشاق رہے نہ کبوتر۔ تختہ ہی پلٹ گیا۔

آجکل کیا ہے۔ دو آنے کا لفافہ لیا۔ غلط سلط اردو یا انگریزی میں چند فرسودہ فقرے لکھے۔ اور چپکے سے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اگر محبوب

کے والدین کے ہاتھ لگ گیا۔ تو کالج سے نکالے گئے۔ اور نہ لگا تو کھٹاک سے جواب آگیا۔ لیجئے اب جواب کا جواب لکھتے رہیئے۔

آپ کسی پہلو سے اس مسئلہ کو دیکھیں۔ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ خط کا جواب نہ دینے میں جو راحت اور مسرّت ہے وہ خط کا جواب دینے میں نہیں۔ خط کا جواب تو جاہل سے جاہل انسان دے سکتا ہے لیکن خط کا جواب نہ دینے کے لئے بڑی سمجھ۔ ہمّت اور دُور اندیشی کی ضرورت ہے۔ مالی نقطۂ نگاہ سے ہی دیکھئے۔ اگر آپ متواتر تین چار سال احباب کے خطوط کا جواب نہ دیں۔ تو نہ صرف آپ ڈاک خانے میں جا کر "قطار" میں کھڑا ہونے کی زحمت سے بچے رہیں گے۔ بلکہ آپ کے پاس اتنی رقم جمع ہو جائے گی جس سے آپ اپنے درزی کا بِل ادا کر سکیں گے۔ بس درزی کا بِل ادا کیجئے اور درزی کی دُعائیں لیجئے۔ اور خدا کا شکر بجالائیے کہ اس نے آپ کو اتنی توفیق دی کہ آپ زندگی میں کم از کم ایک بِل تو ادا کر سکے!

سوم پرکاش ساہنی پرنٹر و پبلشر نے باہتمام اشوکا پریس دریا گنج میں چھپوا کر راجپال اینڈ سنز دہلی شائع کیا!